بند راستے

ابن کنول

برقی کتاب کی جمع و ترتیب: اعجاز عبید

اے آدمی تجھ کو تکلیف اٹھانی ہے اپنے رب تک پہنچنے میں سہہ سہہ کر۔ پھر اس سے ملنا۔۔ سو جس کو ملا اعمال نامہ اس کے داہنے ہاتھ میں تو اس سے حساب لیں گے آسان حساب اور پھر آئے گا اپنے لوگوں کے پاس خوش ہو کر اور جس کو ملا اعمال نامہ پیٹھ کے پیچھے سے سو وہ پکارے گا موت موت اور پڑے گا آگ میں۔ وہ رہا تھا اپنے گھر میں بے غم، اس نے خیال کیا تھا کہ لوٹ کر نہ جائے گا۔ کیوں نہیں، اس کا رب اس کو دیکھتا تھا۔۔۔
(القرآن، سورۂ انشقاق)

بعد ورق گردانی کے ایک قاری نے یوں استفسار کیا:
''اے قلم کارِ ذی ہوش! تو کیا بیان کرتا چاہتا ہے؟ تیرا مقصد کیا ہے؟''
قاری کے اس سوال پر قلم کار نے نظریں اٹھائیں اور کہا:
''میں اس عالمِ آب و گِل میں ابنِ آدم کے افعال و اعمال کو دیکھ کر جو کچھ محسوس کرتا ہوں، قلم بند کر دیتا ہوں۔ اور میں چاہتا ہوں کہ میرا قاری بھی اس درد اور احساس کے دریا سے گزرے کہ جس سے میں گزر رہا ہوں''
ا۔ ک۔

انتساب

ڈاکٹر اسلم حنیف
اور
ڈاکٹر جلال انجم
کے نام

ہمارا تمہارا خدا بادشاہ

پورے شہر میں خوف و ہراس برسات کے بادلوں کی طرح چھا گیا تھا، ہر شخص حیران و پریشان تھا کسی کو یہ معلوم نہیں تھا

کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اس آسمانی عذاب کا سبب کیا ہے؟ کیوں ہر روز ایک شخص کی زندگی کی ختم ہو جاتی ہے۔
ہوا یوں تھا کہ ایک روز جب آفتاب کی روشنی عالم آب و گل کو منور کر چکی تھی، بازار اور دکانیں معمول کے مطابق پر رونق ہونے لگی تھیں کہ فضا میں ایک عقاب تیز رفتار پرواز کرتا ہوا نظر آیا۔ قابل ذکر بات یہ تھی کہ اس کے پنجوں میں ایک مارِ سیاہ لٹکا ہوا تھا تھوڑی دیر تک وہ عقاب بازار کے اوپر منڈ لاتا رہا۔ پھر یوں ہوا کہ وہ سانپ بازار میں خرید و فروخت کرتے ہوئے ایک شخص کی گردن پر جا پڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ آدمی کسی کو مدد کے لیے پکارتا، سانپ نے اپنے زہریلے پھن سے اس کی پیشانی کو داغ دیا، ابھی کوئی دوسرا شخص اس کے قریب بھی نہ پہنچا تھا کہ عقاب زمین کی طرف جھپٹا اور سانپ کو اپنے پنجوں میں دبا کر غائب ہو گیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ کوئی شخص بھی کوئی رائے قائم نے کر سکا اور اس حادثہ کو محض ایک اتفاق سمجھا گیا۔
لیکن............
روز فردا پھر ایک عقاب اُس شہر پر منڈلاتا ہوا دکھائی دیا۔ جس کے پنجوں میں مارِ سیاہ دبا ہوا تھا اور جب وہ عقاب شہر کے وسط میں پہنچا تو اس کے پنجوں سے نکل کر وہ سانپ ایک شخص کی گردن پر آ گیا۔ پھر وہی ہوا کہ اس نے اس آدمی کو ڈس لیا اور عقاب سانپ کو اپنے پنجوں میں دبا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔
اسے بھی اتفاق ...... دوسرا اتفاق کہا جا سکتا تھا لیکن دوسرا اتفاق اہل شہر کے لیے تشویش کا باعث بھی بنا۔
اور جب تیسرے روز بھی یہ حادثہ پیش آیا تو تمام افراد شہر کو اپنی گردنوں پر سانپ اور سروں پر عقاب اڑتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ صاحب دانش غور و خوض میں مشغول ہوئے کہ اب اتفاق نہیں ہے۔ اتفاق مسلسل نہیں ہوتا۔ پورے شہر میں اجتماعی مشورے ہونے لگے، مفتیان شہر نے اعلان کیا کہ اس شہر میں گناہ بڑھتے جا رہے ہیں۔ شاید یہ خدا کے عذاب کی ایک شکل ہے کہ اس سے پہلے بھی آسمانی پرندوں نے کنکریاں برسائی تھیں اور جو لوگوں کے سروں میں اُتر گئی تھیں۔ اے لوگو! عبادت گاہوں کی طرف رجوع کرو۔ شاید اس بلائے آسمانی سے نجات ملے۔ شہر کی عورتوں نے اپنے شوہروں کی جان کی امان کے لیے اپنے سروں کو برہنہ کر کے خدائے ذوالجلال کے روبرو دست دعا بلند کیے۔
بازار بے رونق ہونے لگے۔ لوگوں کی آمد و رفت کم ہو گئی۔ پھر چند لوگوں نے یہ طے کیا کہ آئندہ جب بھی عقاب اپنے پنجوں میں سانپ لے کر آئے گا تو اسے کسی طرح ہلاک کر دیں گے۔ پھر یہی ہو اکہ جب عقاب نے اپنے پنجوں سے سانپ کو آزاد کیا تو اس کی گھات میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ لیکن عقاب ان کے حملہ کی زد سے بچ کر نکل گیا تاہم ان سب نے اس سانپ کو ہلاک کر دیا جو بازار میں موجود ایک شخص کی گردن میں لپٹ کر اس کی پیشانی کو اپنی زہریلی زبان سے چوم چکا تھا۔ سانپ کو ہلاک کرنے کے بعد سب نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب اہل شہر اس عذاب سے نجات پا گئے تھے۔ سب نے خوشیاں منائیں۔ عبادت گاہوں میں سجدہ ہائے شکر ادا کیے گئے۔ بازار میں گھومتے افراد کے چہروں پر ایک بار پھر خوشی کی چمک لوٹ آئی۔
اگلی صبح بہت سکون رہا، لوگ اپنے گھروں سے نکل کر بازاروں میں پہنچے، خوف تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ لیکن یہ کیا؟
اچانک پھر آسمان پر عقاب پرواز کرتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے پنجوں میں بدستور سانپ دبا ہوا تھا اسی لمحہ عقاب کے پنجوں میں دبا ہوا سانپ ایک شخص کی گردن پر گرا اور اس نے اپنے زہر کو اس شخص کی پیشانی پر اگل دیا۔ عقاب نے اُسے اپنے پنجوں میں اُٹھا لیا لیکن قبل اس کے کہ وہ لوگوں کی نظروں سے روپوش ہوتا ایک نوجوان نے بڑھ کر اپنی بندوق سے اس کو نشانہ بنایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ عقاب اور سانپ دونوں ہی زمین پر آگرے۔ افراط خوشی سے لوگوں نے نوجوان کو کاندھوں پر اُٹھا لیا کہ اس کی خاص دماغی، چستی اور چالاکی کے سبب ایک عذاب اہل شہر کے سروں سے ٹل گیا۔ اس روز گزشتہ روز سے زیادہ خوشیاں منائی گئیں کہ اب عقاب بھی ختم ہو چکا تھا۔
پھر کئی روز تک سکون رہا، نہ کوئی عقاب آیا اور نہ سانپ کسی کے اوپر گرا، سب خوش تھے، بازاروں اور دکانوں پر رونق ہونے لگی تھی اور لوگ گذرے ہوئے حادثوں کو بھولتے جا رہے تھے لیکن پھر ایک دن...........
آسمان پر کئی عقاب بیک وقت پرواز کرتے ہوئے نظر آئے۔ سب کے پنجوں میں مار سیاہ دبے ہوئے تھے۔ اور جب وہ ایک مجمع کے اوپر پہنچے تو انہوں نے پنجوں میں دبے ہوئے سانپوں کو چھوڑ دیا اور سانپوں نے کئی لوگوں کی پیشانیوں کو زہر آلود کر دیا۔ عقاب پھر سانپوں کو لے کر غائب ہو گئے تھے۔
اس بار خوف ہوا کی طرح گلیوں اور گھروں میں گھس گیا تھا، ہر شخص پریشان تھا کہ اس کا بچنا مشکل ہے لوگوں نے اپنے گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر لیے تھے بازاروں میں گھومنے والوں کی تعداد کم ہو گئی تھی۔ اس رات تمام اہل شہر ایک جگہ جمع ہوئے اور بہت دیر تک سوچتے رہے کہ اس عذاب سے نجات کا طریقہ کیا ہے۔ عقل حیران تھی، دست و پا بے بس تھے۔ شاید سانپ ان کا مقدر بن گئے تھے۔ ہر شخص اپنی گردن پر سانپ کی گرفت محسوس کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

سانپ انہیں کی گردنوں پر کیوں گرتے ہیں جن کے سروں پر اونچے مکانوں کی چھتیں نہیں ہوتیں۔ جن کو زندگی کا تمام سفر پیدل طے کرنا ہوتا ہے۔ جو موسوں کی تبدیلیوں کو اپنے جسموں پر برداشت کرتے ہیں۔ سوچتے سوچتے جب ان کے ذہن تھک گئے تو سب نے فیصلہ کیا ہم سب جہاں پناہ کے روبرو جا کر اپنی اس مصیبت کا حال بیان کر یں گے اور اس سے درخواست کریں گے کہ وہ ہمیں اس عذاب سے نجات دلائے کہ خدا نے رعایا کی سر پرستی و محافظت اس کے ذمہ کی ہے۔

دوسرے روز تمام اہل شہر ایک جلوس کی شکل میں جہاں پناہ کی رہائش گاہ پر پہنچے اور اپنا حال بیان کیا۔ جہاں پناہ ان سے محبت اور شفقت سے پیش آئے اور کہا۔

''ہم جانتے ہیں کہ ہماری رعایا ایک عذابِ آسمانی میں گرفتار ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہے اور ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ تم سب ہماری اولاد کی طرح ہو ہم تمہارے لیے فکر مند ہیں۔ اور کوشش کریں گے کہ تم لوگوں کو جلد اس مصیبت سے نجات ملے۔ ہم نے اپنے وزیروں کی ایک جماعت کو اس کی تحقیقات کے لیے متعین کیا ہے۔''

جہاں پناہ کی اس بات سے سب خوش ہوئے کہ وہ اسے اپنا نا خدا جانتے تھے۔ سب نے بیک زبان جہاں پناہ کے اقبال کی بلندی کا نعرہ لگایا اور دعائے خیر دی۔ پھر اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔ ابھی چند ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ جہاں پناہ کے عالیشان محل کے چاروں دروازوں سے چار بلند پرواز عقاب اپنے پنجوں میں سیاہ سانپوں کو دبائے ہوئے نکلے اور مجمع کے اوپر چھا گئے۔ آئی ہوئی رعایا نے علم غیض و غضب میں جہاں پناہ کی طرف دیکھا وہ اب بھی کہہ رہا تھا ''تم سب ہماری اولاد کی طرح ہو۔ ہم تمہارے لیے فکر مند ہیں۔''

***

وارث

جس وقت بادشاہ کے وصال کا وقت قریب آیا تو اُس نے اپنے قریب ترین وزیروں کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا:

''عزیزو! تم سب ہمیں بے حد عزیز ہو، ہماری زندگی کا سرمایہ ہو، ہم اپنے رب کے بعد تمہارے شکر گذار ہیں کہ تم نے ہماری زندگی کے سفر کو آسان کیا، ہر مشکل ساعت میں تم ہمارے مد گار ہوئے۔''

''اے سلطان مہربان آپ کی خدمت کرنا ہمارے لیے اعزاز و افتخار کا باعث ہے کہ آپ کی بدولت ہمیں نجات ملے گی۔'' سب کے لہجہ میں عاجزی و انکساری تھی، بادشاہ نے پھر کہا:

''رفیقو! ہماری زندگی کا سفر اب تمام ہونے کو ہے، ہم نے پوری عمر تمہاری مدد سے اپنی سلطنت کو قائم رکھا اور اس کی حدوں کو وسعت دی، لیکن اُس خالقِ کائنات نے دنیا کی تمام نعمتیں ہمیں عطا کیں بجز ایک وارث کے۔ آج جب کہ ہمارا آفتاب حیات غروب ہونے کو ہے ہم خود کو تنہا محسوس کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ اس تخت کا کوئی وارث نہیں۔ آج تک ہم نہ تم کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھا۔ اس لیے اس تاج شاہی کے حقدار بھی تم ہی ہو۔''

بادشاہ کی یہ بات سُن کر چاروں وزیر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، ہر ایک کو اپنا قدر دوسرے کے مقابلے میں بلند نظر آنے لگا اور ہر ایک اپنے تئیں بادشاہ کا وارث محسوس کرنے لگا۔ بادشاہ نے پھر کہا:

''اب ہم چاہتے ہیں کہ تم اس بارِ عظیم کو سنبھالو، لیکن اس بات کا فیصلہ کرنا ہے کہ تم چاروں میں سب سے زیادہ لائق کون ہے؟ جو کارِ سلطنت کو بحُسن و خوبی انجام دے سکے۔''

وہ سب اپنے چہروں پر عقل و فراست کے تاثرات نمایاں کر کے اس طرح بادشاہ کی طرف دیکھنے لگے جیسے بادشاہ ابھی اُن سے کہے گا ہاں تم سب سے بہتر ہو۔ اس ایک لمحے میں ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے موجود محبت ختم ہو گئی اور ذہنوں میں دربار کا سب سے پرانا خادم ہوں اور بادشاہ کی قربت مجھے سب سے زیادہ نصیب ہوئی ہے اس لیے حکومت کا حقدار صرف میں ہوں۔ اور جا نثار خاں سوچ رہا تھا کہ میں نے بادشاہ کو کئی مورچوں پر موت سے بچایا ہے بادشاہ ضرور میرے حق میں فیصلہ کرے گا، خرد مند کا خیال تھا کہ بادشاہ اکثر مشکل مسائل میں مجھ سے مشورے لیتا ہے اور میری صلاح پر عمل بھی کرتا ہے اس لیے نظامِ سلطنت کو چلانے کی ذمّہ داری بھی مجھے ہی سونپے گا لیکن ابو شاطر جسے شاہی دربار میں آئے ہوئے صرف چند برس ہوئے تھے اور ان چند برسوں میں وہ اپنی چالاکی اور طراری کے سبب بادشاہ کے بہت قریب ہو گیا تھا، اس بات پر غور کر رہا تھا کہ کس طرح ان تینوں وزیروں کو آپس میں لڑوایا جائے تاکہ یہ تینوں آپس میں لڑ کر خود بخود تخت شاہی کا راستہ اس کے لیے صاف کر دیں۔ بادشاہ ان چاروں وزیروں کے چہروں کو پڑ ھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ:

''اور اس فیصلے کے لیے ہم نے طے کیا ہے کہ تم چاروں کا امتحان لیں اور جو اس امتحان میں کامیاب ہو ما بدولت بدستِ خود اس کی تاجپوشی فرمائیں کیا تم اس آزمائش کے لیے تیار ہو'' بادشاہ نے استفسار کیا۔ ان چاروں نے بیک زبان کہا۔
''ظلِ الٰہی کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ ہمارے لیے حکمِ خداوندی کا درجہ رکھتا ہے اور اس کی تعمیل ہمیں توقیر بخشتی ہے۔''
''ہمیں تم سے یہی اُمید تھی۔ تم لوگوں کی اسی فرمانبرداری نے ہمیں تمام زندگی حوصلہ بخشا اور ہمارے تمام مسائل بآسانی دور ہوئے اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ سرِ دست ہمارے سامنے جانشینی کا جو مسئلہ در پیش ہے وہ بھی جلد از جلد حل ہو جائے گا۔''
بادشاہ ان کی اس اس بات سے مسرور ہوا اور کہا۔
''مابدولت تمہیں چھ ماہ کی مہلت دیتے ہیں اور تم چاروں کو الگ الگ ملکوں میں جانے کا حُکم دیتے ہیں۔ بعد چھ ماہ کی مدّت گذرنے کے تم اس عرصہ میں کی گئی اپنی کار گذاریوں کو ہمارے رُوبرو پیش کرو گے اور تمہاری کار گذاریوں کے پیش نظر ہم وارثِ تخت و تاج کا فیصلہ فرمائیں گے۔ یہی تمہارا امتحان ہو گا۔ جاؤ سفر کی تیاری کرو اور کل آفتاب کے طلوع ہوتے ہی تم اپنی سفر اختیار کرو۔ مابدولت چھ ماہ کی مدّت ختم ہونے کا انتظار کریں گے''۔
اور پھر وہ چاروں کورنش ادا کر کے دیوانِ خاص سے رخصت ہوئے۔ ان چاروں کا دل اس امید سے سرشار تھا کہ بعد چھ ماہ کے وہ مسندِ شاہی پر متمکن ہوں گے اور اہلِ دربار ان کے روبرو کو رنش ادا کریں گے۔ مستقبل کے اسی منظر کو آنکھوں میں سما کر روز فردا وہ چاروں اپنے شہر سے روانہ ہوئے۔
وقت گذرنے لگا، دن بیتنے لگے، بادشاہ اور دربار کے دیگر امرا ء وزراء منتظر تھے اس دن کے جب ان چاروں کو اپنے وطن لوٹ کر آنا تھا اور جب چھ ماہ کی مدّت پوری ہونے میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تو سب نے اُن کے استقبال کا اہتمام کیا کہ ان ہی میں سے ایک بادشاہ کا جانشیں بننا تھا۔
پھر یوں ہوا کہ جب دوسرے دن مقراض آفتاب نے دامنِ شب تار تار کیا تو چاروں سمت سے چار گھوڑ سوار نظر آئے۔ وہ چاروں وہی بادشاہ کے معتمدِ خاص تھے جنہیں چھ ماہ قبل بادشاہ نے ایک امتحان کے لیے رخصت دی تھی۔ خواص و عوام نے ان کا خیر مقدم کیا۔ وہ چاروں اس خیر مقدم سے خوش ہوئے کہ ان کے اندر شاہانہ تمکنت بیدار ہونے لگی تھی۔ شہر میں داخل ہونے کے بعد چاروں وزیر قلعۂ شاہی میں پہنچے اور باریابی کی اجازت چاہی، بادشاہ نے جو کہ ان کا منتظر تھا انہیں دیوانِ خاص میں حاضر ہونے کی اجازت عطا کی۔ چاروں نے بادشاہ کے قریب پہنچ کر کورنش ادا کی اور بادشاہ کا اشارہ پا کر اس کے روبرو صندلیوں پر بیٹھ گئے۔ بعد چند لمحوں کے بادشاہ نے ابو عقیل سے دریافت کیا۔
''اے ابو عقیل! تم بیان کرو کہ اس چھ ماہ کے عرصہ میں تم پر کیا گذری؟''
ابو عقیل اس بات سے خوش ہوا کہ بادشاہ نے سب سے پہلے اس کا احوال معلوم کیا اس نے کہا:
''عالم پناہ! میں اپنے ملک سے روانہ ہونے کے بعد جب مُلک اشباب میں پہنچا تو میری بزرگی کا لحاظ کرتے ہوئے اہل شہر نے مجھے بڑی عزّت دی۔ ہر شخص نے مجھے اپنا مہمان سمجھا، ان کے اس سلوک سے میں خوش ہوا۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ اس ملک کا بادشاہ جوان العمر ہے اور نا تجرکار ہے اس لیے سلطنت کے انتظام میں اُسے دشواریاں پیش آ رہی ہیں، اتفاق یہ تھا کہ اس کے امراء بھی نو عمر اور نا تجربہ کار تھے۔ رفتہ رفتہ میری آمد کی اطلاع بادشاہ تک پہنچی، بادشاہ نے مجھے طلب فرمایا اور دربار میں حاضر ہونے کے بعد مجھے خصوصی اعزاز سے نوازا۔ حضور کی رفاقت میں اس حقیر نے بہت کچھ سیکھا تھا سو اس بادشاہ کو بتایا۔ چند ماہ کے اندر ہی نظامِ سلطنت میں خوشگوار تبدیلی آ گئی۔ جوان العمر بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں تمام عمر اس کی سلطنت میں رہوں لیکن میں نے اسے اپنی مجبوری بیان کی اور واپس وطن لوٹ آیا۔'' اتنا کہہ کر ابو عقیل چُپ ہو گیا۔ اب بادشاہ نے جانباز خاں سے معلوم کیا کہ تم نے کیا کارنامہ انجام دیا وہ کہنے لگا:
''جہاں پناہ کی عمر دراز ہو! میں جب ملک اشراق میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہاں کے لوگوں کے چہروں پر ایک خوف طاری ہے میں نے اس کی وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ اس ملک کا بادشاہ ایک مصیبت میں گرفتار ہے وہ یہ کہ پڑوسی ملک کے بادشاہ نے حملہ کرنے کی دھمکی دی ہے اور اس کی فوجیں اس ملک سے روانہ ہو چکی ہیں۔ لیکن ملک اشراق کا بادشاہ اپنے اندر اس سے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا اور قلعہ بند ہونے کا ارادہ کر رہا ہے۔ یہ سُن کر میں بادشاہ تک پہنچنے کی تدبیر کی اور بادشاہ کو کئی اہم جنگی مشورے دیے۔ بادشاہ نے مجھ پر اعتبار کیا اور فوج کی کمان میرے سُپرد کی۔ میں نے اپنی بہادری سے حملہ آوروں پر اس طرح حملہ کیا کہ ان کی ہمتیں ٹوٹ گئیں اور وہ شکست خوردہ اپنے ملک کو لوٹ گئے۔ اس ملک کا بادشاہ میری ہمت اور بہادری سے بہت خوش ہوا اور اس نے مجھے بے شمار اعزازات و خطابات سے نوازا اور مستقل فوج کی کمان سنبھالنے کی درخواست کی، لیکن میں معذرت کر کے واپس لوٹ آیا۔''
جانباز کی بات سننے کے بعد بادشاہ خرد مند سے مخاطب ہوا۔ خرد مند بیان کرنے لگا کہ:
''ظلِ سبحانی! وطن عزیز سے وداع لینے کے بعد میرا پڑاؤ ملک جنوبین میں ہوا۔ وہاں کے باشندے بہت خوش اخلاق اور ملنسار

طبیعت کے مالک تھے لیکن ہر چہرے پر ایک فکر نمایاں تھی اس کا سبب یہ تھا کہ ہر سال اس ملک میں سیلاب آتا تھا اور پوری فصل کو تباہ کر دیتا تھا جس کی وجہ سے مُلک میں بھُک مری اور بیماری پھیلتی تھی، سیلاب کو روکنے کے لیے ایک بڑے باندھ کی ضرورت تھی لیکن اس باندھ کے اخراجات اُٹھا نے کے لیے شاہی خزانے میں رقم ناکافی تھی۔ بادشاہ بھی سیلاب کے سبب سے متفکر رہتا تھا۔ میں نے اس ملک کے لوگوں سے مشورہ کیا اور کہ سیلاب کو روکنے کا مسئلہ صرف بادشاہ کا نہیں، بادشاہ تو یوں بھی ہر وقت اپنی رعایا کے لیے فکر مند رہتا ہے۔ اس لیے تم لوگوں کو چاہیے کہ تم بادشاہ کی مدد کرو۔ پھر میں نے مشورہ دیا کہ ملک کا ہر آدمی صرف ایک روپیہ اس کام کے لیے جمع کرے۔ میری اس بات کو سب نے تسلیم کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں روپے اکٹھے ہو گئے۔ بادشاہ کو جب یہ رقم پیش کی گئی تو وہ بہت خوش ہوا اور اس نے کہا کہ ہمیں اپنے اقتصادی مسائل کو اسی طرح حل کرنا چاہیے۔ اس نے مجھے بہت عزّت دی اور اپنے مشیر خاص کے عہدے سے نوازا لیکن میں چھ ماہ کی مدّت ختم ہونے سے چند روز قبل وہاں سے رُخصت ہوا۔''

''خرد مند اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ بادشاہ نے ابو شاطر سے کہا کہ

''اب تو اپنا کارنامہ بیان کر۔'' ابو شاطر نے کہا کہ:

''جہاں پناہ کے قدموں سے رخصت ہو کر میں ملک خلد آباد میں پہنچا، دیکھا کہ وہاں کئی قومیں آباد ہیں اور سب خوش حال ہیں۔ ایک دوسرے سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں۔ اُٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا سب ایک ساتھ ہے۔ ملک جنت نظیر ہے لیکن اس خوشحالی سے بادشاہ اور امراء پریشان تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ رعایا تمام فکروں سے بے نیاز ہونے کے سبب ہر وقت بادشاہ، امراء اور اس کے انتظام پر تنقید کرتی رہتی تھی۔ آئے دن بادشاہ کے خلاف جلسے ہوتے اور جلوس نکلتے۔ حکمراں طبقہ اس سے پریشان تھا۔ ایک دن اتفاق سے میں بادشاہ تک پہنچ گیا۔ بادشاہ نے مجھ سے مشورہ طلب کیا۔ میں نے کہا اگر اس ملک میں رہنے والی قوموں کو آپس میں لڑوا دیا جائے تو ان کا ذہن حکومت کی کمزوریوں کی جانب سے ہٹ جائے گا۔ بادشاہ کو یہ تجویز پسند آئی۔ اُس نے یہ ذمّہ داری بھی میرے سپُرد کی، پھر میں اس ملک کے شہروں میں گھُومتا رہا اور سوچتا رہا کہ کس طرح قومی یک جہتی کو ختم کیا جائے۔ بالآخر میں کامیاب ہوا، میں نے قوموں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے نفرت کا زہر بھر دیا اور جب وہ زہر اُگلا تو پورے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات پھیل گئے۔ یک جہتی ٹوٹ گئی۔ جو لوگ ہم نوالہ اور ہم پیالہ تھے وہ خُون کے پیاسے ہو گئے۔ رعایا کا سکون ختم ہوا لیکن بادشاہ کا عیش و آرام لوٹ آیا کیوں کہ اب لوگ بادشاہ کے بجائے ایک دوسرے پر کیچڑا چھال رہے تھے۔ اتنا کرنے کے بعد میں وہاں سے چلا آیا۔''

ابو شاطر کی یہ باتیں سن کر تینوں وزیروں نے اس طرح اس کی جانب دیکھا جیسے اس نے کوئی بڑا گناہ کیا ہو۔ لیکن ابو شاطر کے چہرے پر اطمینان تھا۔ اب وہ چاروں بادشاہ کے فیصلے کے منتظر تھے۔ بادشاہ یوں گویا ہوا:

''مابدولت خوش ہوئے کہ تم نے ہمارے حکم کی تعمیل کی اور ہماری موت کو آسان کر دیا کہ اب ہمارے بعد ہماری سلطنت قائم رہے گی کہ ہمیں اس ملک کا بادشاہ مل گیا ہے۔ ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے بعد ہماری سلطنت کا وارث ابو شاطر ہو گا''۔

***

صرف ایک شب کا فاصلہ

بعد کئی صدیوں کے زید بن حارث کی آنکھوں میں آفتاب کی کرنیں چُبھنے لگیں، اس نے آہستہ آہستہ پلکوں کو حرکت دی اور اپنے گرد دیکھا، روشنی دھیرے دھیرے غار کے اندر داخل ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے خوابیدہ ساتھیوں پر نظر ڈالی اور محسوس کیا کہ ان کی پلکوں کے نیچے تپش پھیلنے لگی ہے اور عنقریب یہ وا ہو جانا چاہتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ اس کا کوئی ساتھی اپنی پلکوں کو وا کرتا اور آفتاب کی روشنی آنکھوں میں اُتار لیتا۔ اُس نے آواز دی۔

''ساتھیو! کیا تم اپنی آنکھوں میں روشنی کی چُبھن محسوس نہیں کرتے۔''

اور اس آواز کے ساتھ سب کی آنکھوں میں آفتاب اُتر گیا۔ اب سب نے اپنے جسموں کو حرکت دی اور نیم دراز ہوئے۔ ابو سعد کفِ دست سے اپنی آنکھوں کو ملتا ہوا یوں گویا ہوا:

''اے حارث کے بیٹے کیا ہم سوئے ہوئے تھے۔''

''ہاں شاید ہم سب ہی سو گئے تھے'' زید بن حارث نے جواب دیا اور استفسار کیا۔

''اے عمر کیا تم جانتے ہو کہ ہم نے کتنا عرصہ عالمِ غفلت میں گذارا۔''

''صرف ایک شب۔'' پھر وہ سب ہی اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگے۔ وہ ایک غار میں تھے، اپنے آپ کو غار کی پناہ میں دیکھ کر طلحہ بن عبید نے اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا۔
''دوستو! کیا تمہیں یاد ہے کہ ہم نے اس تاریک غار میں پناہ کیوں لی تھی؟''
''ارے طلحہ کیا تمہیں یاد نہیں رہا۔'' زید نے طلحہ سے پوچھا۔ قبل اس کے کہ طلحہ کچھ جواب دیتا ابو سعد کہنے لگا۔
''عزیزو! یہ باتیں بوقتِ فرصت دہرائی جائیں گی۔ سرِ دست اشتہا بڑھتی جاتی ہے۔ چلو ہم سب بستی کی جانب چلیں اور کھانے کا انتظام کریں۔''
ابو سعد کے مشورہ کو سب نے قبول کیا اور اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کہ جن میں دینار موجود تھے۔ پھر وہ چند نوجوان بستی کی سمت روانہ ہوئے۔ کچھ دور چلنے کے بعد ہی انہیں بستی دکھائی دینے لگی۔ لیکن انہوں نے اس بستی کو اس بستی سے مختلف پایا جسے چھوڑ کر انہوں نے غار میں پناہ لی تھی۔ اہل شہر کے لباس اور چہرے ان سے مختلف تھے۔
کچھ دیر تک وہ حیران و پریشان رہے۔ پھر اسی عالم میں ایک دوسرے سے کہنے لگے۔
''اے زید شاید ہم راستہ بھٹک گئے۔''
''تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ قوم وہ نہیں، جن کے بیچ ہم رہتے تھے۔''
''فی الحال یہیں ٹھہرتے ہیں اور اس ملک کو دیکھتے ہیں۔ پھر ہم اپنے ملک کی راہ پوچھیں گے۔''
وہ چاروں ایک جگہ کھڑے ہو کر لوگوں کی آمد و رفت دیکھنے لگے کہ ایک راہ گیر ان کے نزدیک سے گذرا۔ زید بن حارث نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔
''اے برادر عزیز اس ملک کا حاکم کون ہے؟''
اس نے ان کو بنظر غور دیکھا اور کہا۔
''یہاں عوام کی حکومت ہے۔''
وہ سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ابو سعد نے نا فہمی کا اظہار کیا۔
''اے عزیز کیا تم وضاحت سے بیان کر سکو گے کہ عوام کی حکومت سے کیا مراد ہے؟''
''ہمارے یہاں حاکم کے انتخاب کے لیے عوام کی رائے حاصل کی جاتی ہے اور جس شخص کو اکثریت چاہتی ہے حاکم بنایا جاتا ہے۔''
''کیا منتخب شدہ شخص تمام عمر حاکم رہتا ہے اور کیا اس کے بعد اس کی اولاد تخت نشین نہیں ہوتی۔'' عمر نے پھر استفسار کیا۔
''نہیں! حاکم کا انتخاب ہر پانچ برس بعد ہوتا ہے۔ اور اس حکومت کے آئین کے مطابق اس کی اولاد اس کی جانشین نہیں ہوتی۔ بلکہ عوام جب چاہیں حاکم کو بدل سکتے ہیں۔'' راہ گیر اتنا کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ ان سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ انہیں اپنے اندر خوشی کی کرنیں پھوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں وہ سب کہنے لگے۔
''دوستو! کیا ہم نے اپنے ملک میں اس طرح کی حکومت کا نفاذ نہیں چاہا تھا۔ شاید ہم صحیح ملک میں پہنچ گئے ہیں۔ اگر یہاں کی حکومت نے اجازت دے دی تو یہیں مستقل قیام کریں گے۔''
وہ سب عوامی حکومت کے نام سے اس قدر خوش ہوئے کہ انہیں اس بات کا خیال ہی نہ رہا کہ اپنی اشتہا مٹانے کے لیے بستی کی سمت آئے تھے، ان کا شوقِ دیدار شہر لمحہ بہ لمحہ بڑھتا گیا اور پھر سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ہم سب اول وقت میں اس شہر مقدس کی زیارت کریں کہ جس میں عوام کی حکومت ہے اور اس فیصلے کے بعد وہ شہر کے ایک راستے پر بہ ہمراہ حیرت و استعجاب چلنے لگے۔ تھوڑی دور چلے تھے کہ شہر کے ایک راستے سے ایک جلوس آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ ٹھہر کر جلوس کا انتظار کرنے لگے۔ جلوس میں شامل افراد حاکم وقت کے خلاف آوازیں بلند کر رہے تھے، اسے دغا باز اور فریبی کہہ رہے تھے۔ وہ بھی جلوس کے ساتھ ہو لیے اور اس بات سے خوش تھے کہ بعد مدت کے ایسا ملک دیکھا ہے کہ جس میں ہر شخص کو ہر بات کہنے کی آزادی ہے وہ بات خواہ حاکم وقت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ جب وہ مجمع ایک میدان میں ٹھہر گیا تو ان میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور یوں گویا ہوا۔
''دوستو! آج پھر وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم سب موجودہ حاکم کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کریں۔ کیا بوقت انتخاب حاکمِ وقت سے تمہاری توقعات یہی تھیں جو آج تم دیکھ رہے ہو، کیا اس حاکم نے تم سے کئے ہوئے وعدوں کو پورا کیا؟ کیا تم نے جو کچھ اس سے مانگا تھا تمہیں ملا، پھر تم کیسے کہتے ہو کہ اس ملک میں عوام کی حکومت ہے؟''
طلحہ بن عبید نے اپنے پاس کھڑے ہوئے ایک شخص سے دریافت کیا۔
''اے عزیزیہ شخص کون ہے؟''
اس نے جواب دیا۔
''اے برادر یہ بھی ان لوگوں میں سے ایک ہے جو عوام کا نمائندہ بن کر اس ملک پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ حاکمِ وقت کے

حریفوں کی صف کا ایک آدمی ہے۔''
''تو کیا عوام اسے پسند کرتے ہیں'' زید بن حارث نے سوال کیا۔
''کچھ عرصہ پہلے عوام نے اسے ایک ریاست کا حاکم منتخب کیا تھا لیکن حاکمِ اعلیٰ کا ہم رائے نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے اپنے اقتدار کا بے جا استعمال اور اسے اپنے عہدے سے برطرف کر دیا۔''
''کیا عوام کی رائے کے بغیر ایسا کیا جا سکتا ہے'' عمر نے معلوم کیا۔
''یہاں عوام کو پانچ برس بعد اپنی رائے دینے کا حق حاصل ہے۔ اس کے درمیان منتخب شدہ حاکم اپنی رائے کو برتر اور بہتر سمجھتا ہے'' اجنبی کا یہ جواب پا کر زید کے ساتھی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ تقریر اب بھی جاری تھی۔ یہاں تک کہ اس شخص کی اشتعال انگیز باتوں کو سن کر مجمع مشتعل ہو گیا اور ان کی زبانیں زہر اگلنے لگیں۔ اسی لمحہ حاکمِ وقت کی فوج کے سپاہیوں نے اس ہجوم پر حملہ کر دیا۔ ہجوم منتشر ہو گیا۔ لوگ زخمی ہوہو کر گرنے لگے سیکڑوں لوگ گرفتار کیے گئے۔ ان چاروں نے بھی اپنے لیے جائے پناہ تلاش کی۔ اسی وقت پورے شہر میں نظر بندی کا اعلان کر دیا گیا۔ گوئی شخص اپنے گھر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ فوج راستوں پر تعینات تھی۔
طلحہ اور اس کے ساتھیوں نے جب اپنے سروں پر آسمان کے بجائے ایک مکان کی چھت دیکھی تو زید بن حارث سے پوچھا کہ وہ اُسے بڑا مانتے تھے
''اے حارث کے بیٹے ہم کس مقام پر ہیں۔ کیا ہم نظر بند کر دیے گئے ہیں۔''
''ہم اس وقت کسی کے مکان میں ہیں اور شاید آفاتِ شہر کا شکار ہو کر نظر بند ہو گئے ہیں۔'' زید اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی ایک شخص ان کے قریب آیا اور استفسار کیا۔
''دوستو! تم لوگ کون ہو اور یہاں کیوں کر پہنچے۔''
''اے عزیز ہم تمہارے شہر میں اجنبی ہیں اور نظر بندی کے نفاذ کے اعلان کے بعد پناہ کی تلاش میں یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ کیا تم ہمیں پناہ دو گے۔'' ابو سعد نے اپنا حال بیان کیا۔
اس شخص نے ان چاروں کے ساتھ بہتر سلوک کیا اور اپنے دستر خوان پر کھانا کھلایا، وہ چاروں اس کے اس سلوک سے خوش ہوئے اور اس کا شکر ادا کرتے ہوئے کہنے لگے۔
''اے مہربان! ہم تمہارے شکر گذار ہیں کہ تم نے ہمیں پناہ دی اور اپنے دستر خوان پر کھانا کھلایا۔ اے محسن اب تم کوئی تدبیر کرو کہ ہم یہاں سے نکل سکیں۔''
''تم ایسے ہنگامی حالات میں کہاں جاؤ گے۔ کہ تم سب مسافر ہو۔ ایسا نہ ہو کہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ۔ مجھے اپنا دوست جانو اور اس غریب خانہ میں اس وقت تک قیام کرو جب تک حالات معمول پر نہ آ جائیں۔'' صاحب خانہ کے اس جواب پر بسلسلہ مشورہ ان لوگوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اس بات پر اتفاق کیا کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یہاں قیام کریں اور اس فیصلے کے بعد انہوں نے آرام کیا اور روز فردا صاحب خانہ سے پوچھا۔
''اے برادر عزیز کیا تم اپنے ملک اور یہاں کی حکومت کے بارے میں کچھ بتاؤ گے۔'' صاحب خانہ نے بنظر غور ان چاروں کو دیکھا اور اپنے شک کا اظہار کیا۔
''دوستو کیا تم میرے اس شک کو دور کر سکو گے کہ تم کسی ملک کے جاسوس ہو۔'' وہ سب حیران و پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، انہیں خاموش دیکھ کر صاحب خانہ نے کہا۔
''تم اس وقت میرے مہمان ہو اور میں نہیں چاہوں گا کہ میری کسی بات سے تمہیں تکلیف پہنچے۔ مجھے یہ شک اس لیے گذرا کہ حاکمِ وقت ملک میں ہونے والے ہر حادثہ کا الزام غیر ملکوں پر عائد کرتا ہے۔''
''وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟'' عمر نے سوال کیا۔
''اس سے وہ خود بے گناہ ثابت ہو جاتا ہے۔ تم لوگوں کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ یہاں ہر شخص دو چہرے رکھتا ہے۔ ایک سیاہ اور ایک سفید۔ سفید چہرہ لے کر وہ سب کے سامنے آتا ہے اور سیاہ سے پس پشت بات کرتا ہے۔''
''ایسا کیوں ہے؟'' طلحہ نے معلوم کیا۔
''یہ بات ابھی تک قابلِ غور ہے اور کوئی شخص اس نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا کہ اس ملک کے لوگ دو چہرہ کیوں ہیں'' صاحب خانہ لا علمی کا اظہار کیا۔ طلحہ نے پھر پوچھا۔
''کیا اس کی کوئی مثال پیش کر سکتے ہو۔''
''یہاں ہر شخص اس کی مثال ہے۔ یہاں حکمراں طبقہ جو عوام کا منتخب کردہ ہے جب عوام کے روبرو آتا ہے تو اتنا عاجز اور منکسر ہوتا ہے جیسے عوام اس کا خدا ہے اور جب وہ کرسیِ اقتدار پر جلوہ افروز ہوتا ہے تو عوام کے سینوں میں چھُرے بھونکتا ہے۔ کل وہ حاکمِ وقت کے خلاف زہر اُگل رہا تھا اور آج وہ دیکھو حاکمِ وقت کی مدح میں قصیدے پڑھ رہا ہے۔''

''میرے عزیز میں نے کہا کہ یہاں سب دو چہرہ لوگ ہیں۔ آج جو میرے ساتھ ہے، ہو سکتا ہے وہ کل میرے ساتھ نہ رہے۔ یہاں لوگ بِک جاتے ہیں۔ یہاں کا حاکم عوام کے نمائندے نہیں چاہتا بلکہ اپنے ہم خیال چاہتا ہے۔ یہاں عوام کے نام پر حکومت کی جاتی ہے۔'' صاحب خانہ کی اِن باتوں کو سُن کر وہ سب کچھ سوچنے لگے اور بہت دیر تک سوچتے رہے کچھ دیر بعد عمر نے پوچھا۔

''دوستو کیا تم سب بھی وہی سوچ رہے ہو جو بات میں سوچ رہا ہوں۔''

انہوں نے پوچھا۔

''تو کیا سوچ رہے ہو؟''

''میں سوچ رہا ہوں کہ یہاں کے لوگ دو چہرہ کیوں ہیں؟''

''ہاں عمر ہم سب بھی یہی سوچ رہے ہیں''

''کیا یہ اُس بات کا ردّ عمل......'' طلحہ نے اتنا کہا تھا کہ زید بن حارث نے اُسے اشارہ سے روک دیا۔ صاحب خانہ نے سب کو عالمِ محویت میں دیکھ کر معلوم کیا۔''

وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ زید بن حارث نے کہ اُن سب میں بڑا تھا کہا۔

''عزیزو! یہ شخص بڑا مہربان اور محسن ہے اس سے کچھ پوشیدہ رکھنا گناہ کا باعث ہو گا۔''

زید کی بات سے سب نے اتفاق کیا پھر طلحہ بن عبید نے یوں بیان کیا:

''اے برادر کچھ عرصہ پہلے ہم نے اپنے ملک کے بادشاہ کے ظلم سے تنگ آ کر اپنا شہر چھوڑ دیا تھا۔ ہم لوگ اپنے ملک میں عوام کی حکومت چاہتے تھے۔ اسی جرم میں بہت سے لوگ قید خانوں میں ڈال دیے گئے۔ ہم چاروں نے قید سے بچنے کے لیے راہ فرار اختیار کی۔ کچھ روز اِدھر اُدھر گھُومتے رہے اور پھر ایک غار میں پناہ لی۔ ہمارے جسم تھکن سے بوجھل ہو گئے تھے۔ اس لیے ہم پر غفلت طاری ہو گئی اور ہم سو گئے۔ دوسری صبح آفتاب کی کرنوں نے ہمیں بیدار کیا اور جب ہمیں بھُوک لگی تو ہم تمہارے شہر میں پہنچ گئے کہ ہمارے پاس دینار موجود تھے، ، طلحہ نے اپنی جیب سے چند سکّے نکال کر اُس شخص کے روبرو کیے، اس شخص نے وہ سکّے دیکھے اور ہنسنے لگا وہ سب حیران ہوئے کہ اس کی ہنسی کا سبب کیا ہے وہ اپنی ہنسی کو روکتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ''تمہارے ملک کا نام کیا ہے؟''

''ہم بلقان کے رہنے والے ہیں'' عمر کے اس جواب سے صاحب خانہ اور زور سے ہنسنے لگا۔ زید نے پوچھا۔

''اے عزیز تمہاری ہنسی کا باعث کیا ہے۔''

اس نے کہا۔

''تم لوگ مجھ سے مذاق کر رہے ہو یا جھوٹ بول رہے ہو۔ تم اس وقت جس ملک میں ہو، اس کا نام بلقان ہے اور یہ سکّے اسی ملک میں تین سو برس پہلے رائج تھے۔''

صاحب خانہ کی اس بات پر وہ سب چونک پڑے۔ ان کی حیرانی اور پریشانی بڑھ گئی، ابو سعد نے متعجبانہ انداز میں پوچھا

''ساتھیو کیا ہم تین سو برس تک اس غار میں سوتے رہے۔''

''لیکن یہ کس طرح ممکن ہے'' عمر نے حیرانی ظاہر کی۔

''خدا ہر چیز پر قادر ہے'' زید بن حارث خود حیران تھا۔

صاحب خانہ ان کی یہ باتیں سن کر خوش ہوا اور عقیدت مندانہ ان کے روبرو آیا اور کہنے لگا۔

''شاید تم ہی وہ لوگ ہو جن کا انتظار میں کئی برسوں سے کر رہا ہوں۔''

''تمہارے انتظار کی وجہ کیا ہے'' طلحہ نے معلوم کیا۔

''کئی برس پہلے ایک بزرگ نے یہ کہا تھا کہ کچھ عرصے بعد چار نوجوان آئیں گے اور وہ بتائیں گے کہ اس ملک کے لوگ دو چہرہ کیوں ہیں۔ ہمارے شہر کی ایک جماعت بہت دن سے آپ لوگوں کی منتظر ہے۔ میں ان سب کو یکجا کرتا ہوں تاکہ آپ کی باتیں سن سکیں۔'' صاحب خانہ کا اضطراب بڑھتا گیا۔

''ٹھہرو ابھی کچھ دیر توقف کرو۔ ابھی اس شہر کے حالات ٹھیک نہیں۔ ہم آج شام کو اس غار کی طرف لوٹ جائیں گے۔ تم کل صبح اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں آنا''

زید نے اسے روکا صاحبِ خانہ نے ضبط کیا۔

دوسرے دن علی الصبح غار کے دہانے پر لوگوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ چاروں طرف امن قائم رکھنے کے لئے فوج تعینات تھی۔ وہ چاروں غار کے اندر حیران و پریشان بیٹھے تھے کہ یا خدا یہ کیسا عذاب ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ شخص کہ جس کے مکان میں وہ مہمان رہے تھے آیا اور کہنے لگا۔

''حضرات باہر لوگ بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

پہلے تو ان لوگوں نے تامل کیا پھر چاروں اس کے ساتھ باہر آئے اور مجمع کا جائزہ کیا۔ سبھی کے چہروں سے اشتیاق ظاہر ہو رہا تھا۔ زید بن حارث نے آگے بڑھ کر یوں بیان شروع کیا۔

''دوستو ہم بھی تم جیسے اور تمہارے ملک کے رہنے والے ہیں۔ لیکن یہ خدا کی عجیب قدرت ہے کہ اس نے تین سو برس ہمیں عالمِ خواب میں رکھا جبکہ ہمیں ایسا لگتا ہے کہ ہم صرف ایک رات سوئے ہیں۔''

تمام مجمع پر سکوت طاری تھا۔ زید کہہ رہا تھا۔

''تین سو برس پہلے ایک خاتون اس ملک کی بادشاہ تھی۔ جس کے ظلم اور جبر سے ہر شخص پریشان تھا۔ وہ صرف اسی امیر کو پسند کرتی تھی جو اس کے سامنے زبان بند کیے، سر جھکائے بیٹھا رہے۔ ایک مرتبہ ملکہ نے عزیز مصر کی طرح خواب دیکھا کہ سات موٹی گائیں ایک میدان میں آئیں پھر سات کمزور گائیں آئیں۔ موٹی گائیں کمزور گایوں کو کھا گئیں۔ ملکہ یہ خواب دیکھ کر پریشان ہوئی اور ہر ایک سے اس کی تعبیر پوچھی، لیکن کوئی نہ بتا سکا۔ پھر ایک بزرگ نے کہ جو ہمیشہ سچی تعبیر بتاتا تھا کہا کہ یہ سات موٹی گائیں سات سال ہیں۔ ان سات سالوں میں خوب غلّہ پیدا ہو گا، پھر سات کمزور گائیں یعنی سات ایسے سال آئیں گے کہ ان میں قحط پڑے گا۔ اگر ملکہ پہلے سات سالوں میں خوب غلّہ اکٹھا کروا لیں تو اگلے سات سال آرام سے گذریں گے۔ ملکہ نے جوکہ خود کو سب سے دانش مند سمجھتی تھی۔ اس تدبیر کو تسلیم نہ کیا اور خود کوئی نئی تدبیر سوچنے لگی۔ اس ملکہ کے ایک نوجوان بیٹا بھی تھا جس نے ماں کو مشورہ دیا۔

''اے والدۂ محترمہ میرے ذہن میں ایک تدبیر ہے جس پر عمل کرنے سے ہمارا ملک قحط کی بلا سے بچ جائے گا۔''

ملکہ اپنے فرزند کی لیاقت پر خوش ہوئی اور کہنے لگی۔

''بیان کر''۔

''اے ملکہ معظّمہ اگر ملک کے سبھی مردوں کی رگ افزائش نسل قطع کر دی جائے تو ہمارے ملک کی آبادی بڑھنے سے رُک جائے گی اور سات سال بعد اس سے بھی کم لوگ ہمارے ملک میں رہ جائیں گے۔ جب آبادی کم ہو گی تو غلّہ کم خرچ ہو گا اور اگلے سات سال ہم پریشان نہ رہیں گے۔''

عورت کہ آدم تا ایں دم ناقص العقل سمجھی گئی ہے۔ اپنے بیٹے کی اس بات پر خوش ہوئی اور اس نے پورے ملک میں اعلان کرا دیا کہ ملک کے تمام مردوں کی رگ افزائش نسل قطع کر دی جائے تاکہ ہمارے ملک میں آئندہ سات سال کوئی بچہ پیدا نہ ہو۔ اس حکم پر فوری عمل کیا گیا بالآخر نتیجہ یہ ہوا کہ آبادی کم ہونے لگی اور پھر آبادی کا بڑا حصّہ قحط کے سات سالوں کی نذر ہو گیا۔ اب ملکہ کو فکر ہوئی کہ اگر یہ بچی ہوئی عورتیں اور مرد بھی ختم ہو گئے تو ملک ختم ہو جائے گا۔ بقیہ مرد اس لائق نہیں تھے کہ بقیہ عورتوں کی سوکھی ہوئی کھیتیوں میں ہریالی لا سکیں۔ بہت غور و خوض کے بعد ملکہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ دوسرے ملکوں سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنے یہاں کے مرد یہاں بھیجیں تاکہ ہمارے یہاں کی عورتیں ان سے مل کر بچےّ پیدا کر سکیں، بمشکل ایک ملک اس کے لیے تیار ہوا۔ اس دوسری قوم کے مردوں سے اختلاط کے بعد یہاں کی عورتوں نے جو بچّے پیدا کیے وہ سب دو چہرہ تھے۔ دوسری قوم کے مردوں نے افزائش نسل کے لیے خاصہ معاوضہ وصول کیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ معاوضہ کی ادائی گی کے بعد پیدا ہونے والی نسل آج بھی معاوضہ پا کر اپنا ضمیر بیچ دیتی ہے۔ اپنے ملک کے بادشاہ کے ظلم سے بچنے کے لیے ہم چودہ برس تک ملک سے باہر رہے اور پھر جب ایک غار میں پناہ لی تو خدا نہ ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا جس سے ہم تین سو برس تک سوتے رہے۔ اور اب اپنے ملک میں عوامی حکومت دیکھ کر خوش ہوئے کہ تین سو برس قبل ہم جس طرح کی حکومت چاہتے تھے وہ ہمارے ملک میں آ چکی ہے جس میں ہر شخص کو ہر بات کہنے کی آزادی ہے۔''

زید بن حارث نے اپنی بات ختم کی ہی تھی کہ لوگوں نے انہیں اپنے کاندھوں پر اُٹھا لیا اور بآواز بلند نعرے لگانے لگے، ان چاروں کے لیے بے پناہ عقیدت ظاہر کی۔ سارے مجمع میں اشتعال پیدا ہو گیا۔ اسی وقت حاکمِ وقت کی طرف سے فوج کو حکم ملا کہ ان چاروں یا وہ گواور دیوانے نوجوانوں کو گرفتار کر لیا جائے، ان کی آزادی امن کے لیے خطرہ ہے۔

***

پہلا آدمی

اور جب بادشاہ نے سفر سے مراجعت کی۔ دار الخلافہ میں پہنچ کر اس نے اپنے وزیر اعظم کو حکم دیا کہ کل دن کے پہلے پہر

میں ہم دربار عام کریں گے۔ شہر میں یہ اعلان کرا دیا جائے۔ تمام خلائق شہر دیوان عام میں جمع ہو۔'' حکم شاہی برفتار برق شہر کے ایک ایک گوشے میں پھیلا دیا گیا۔

روزِ فرد اتمام مرد وزن، پیر و جوان، خرد و کلاں اس طرح اپنے چہروں پر بے تابیاں لیے ہوئے دیوان عام میں اکٹّھے ہوئے جیسے غیب سے کوئی معجزہ ظہور میں آنے والا ہو۔ ہر نظر میں ایک ہی سوال تھا کہ آج بادشاہ ایسا کیا اعلان کرے گا جس کے لیے زچہ و بچہ کو بھی دربادر میں حاضر ہونے کا حُکم ہوا ہے۔ وزیر اعظم نے، جو تخت شاہی کے قریب ایستادہ تھا، ایک گہری نظر اس مجمع پر ڈالی اور بہ آواز بلند پوچھا۔

''کیا ابھی کوئی اور باقی ہے جو دربار میں حاضر نہیں ہوا؟''

تمام حاضرین دربار پیچھے مڑ کر دیکھنے لگے جیسے وہ وزیر اعظم کے جواب دینے کے لیے شہر کے لوگوں کو شمار کر رہے ہوں۔ اچانک ڈیوڑھی سے 'وہ' داخل ہوتا ہوا نظر آیا۔ سب کی نگاہیں اس کے چہرے کا طواف کرنے لگیں۔ وزیر اعظم نے اس کو قہر آلود نظروں سے دیکھا کہ اس نے حکم شاہی کی تعمیل میں تاخیر کی تھی۔ اس کے چہرے پر اضطرابی کیفیت نمایاں نہیں تھی۔ شاید وہ لاعلم تھا کہ آج بادشاہ ایک اہم اعلان کرنے والا ہے۔ نہیں، اسے بھی یہ بات معلوم تھی، لیکن وہ بے قرار نہیں تھا۔ وہ اپنے چہرے پر اطمینان کا نقاب ڈالے ہوئے ایک گوشے میں جا بیٹھا۔ اس نے کسی سے کوئی سوال نہیں کیا۔ جس طرح اور لوگ ایک دوسرے سے استفسار و جواب میں مشغول تھے۔ وہ شہر کا آخری آدمی تھا اور تمام خلائق شہر دیوان عام میں جمع ہو چکی تھی۔ پھر نقارے پر چوٹ ماری گئی۔ نقیب کی آواز سن کر لاکھوں نگاہیں بیک وقت تخت شاہی پر گڑ گئیں۔ چند ساعت کے بعد ہی بادشاہ شاہانہ جلال وجمال کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ تمام درباری کھڑے ہو گئے۔ بادشاہ کی سلامی کے لیے توپیں داغی گئیں۔ جب کبھی بھی دربار عام منعقد ہوتا تو بادشاہ کو توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ توپوں کی آوازیں سن کر نوبیاہتا عورتوں نے اپنے نوزائیدہ بچوں کو اپنی لبریز شیر چھاتیوں میں چھُپا لیا۔

وہ سب چھال اُترے ہوئے تنے کی طرح برہنہ تھے۔ بادشاہ بھی بے لباس تھا۔ زمانۂ قدیم سے وہ سب اسی طرح رہتے چلے آ رہے تھے پھر بادشاہ اور تمام درباری اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے اور بادشاہ یوں گویا ہوا:

''تم سب کو معلوم ہے کہ مابدولت روز گزشتہ ملک بہروپ سے واپس لوٹے ہیں۔ تم لوگوں کے دل مضطرب ہوں گے کہ جلد از جلد وہ بات تمہارے گوش گذار ہو جس کے لیے یہ تاریخی دربار آراستہ کیا گیا ہے۔''

بادشاہ کی آواز پر لاکھوں کے مجمع میں اس طرح سناٹا چھا گیا جیسے وہ قوت گویائی اور حرکت کرنے کی طاقت سے محروم کر دیے گئے ہوں۔ طفلِ نوخیز بھی اپنے بڑوں کی طرح اپنی معصوم نگاہوں میں حیرانیاں سمیٹے ہوئے تھے۔ بادشاہ کہہ رہا تھا:

''ملک بہروپ بہت حسین ملک ہے اور ایک بات جو ہم سب کے لیے باعثِ حیرت ہو گی کہ وہاں کے تمام لوگ مع بادشاہ کے اپنے جسموں پر غلاف کی طرح ایک لباس چڑھائے تھے۔ کیا تم جانتے ہو کہ لباس کیا ہوتا ہے؟'' اور اس سوال پر اُن سب کے سر نفی کا اشارہ کرنے لیے ہلنے لگے کہ وہ سب فرشتوں کی طرح معصوم تھے۔ بادشاہ نے پھر پوچھا۔

''کیا تمہیں اس بات کا علم ہے کہ ہم سب برہنہ ہیں؟''

اس بار بھی سب نے نفی کا اشارہ کیا۔ حاضرین میں سے کسی نے سوال کیا۔

''برہنہ کیا ہوتا ہے؟''

اس سوال پر بادشاہ نے دستک دی۔ ایک خادم اپنے ہاتھوں میں ایک خوان لیے ہوئے حاضر ہوا۔ ناظرین اُچک اُچک کر اس خوان کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر بادشاہ نے خوان پر رکھی ہوئی اس پوشاک زر نگار کو اپنے جسم پر چڑھایا۔ تمام نظریں حیرت و استعجاب سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اُس نے بھی بادشاہ کو متعجب نگاہوں سے دیکھا کہ لباس پہن کر وہ ایک نئی مخلوق معلوم ہو رہا تھا۔ بادشاہ سب کی حیرانی سے خوش ہوا اور بولا۔

''یہی لباس ہے اور ہمیں شاہ بہروپ نے تحفہ میں پیش کیا ہے ـــــمابدولت چاہتے ہیں کہ اس شہر کا ہر فرد یہ لباس پہنا کرے۔ کیا تم اسے منظور کرو گے؟''

حاضرین دربار نے کہ وہ سب عرصۂ دراز سے آئینہ میں اپنی ایک ہی سی شکل دیکھ کر تنگ آ چکے تھے اور جن کی للچائی نظریں بادشاہ کی پوشاک میں پیوست ہو رہی تھیں، بیک زبان ہو کر بخوشی اسے قبول کیا کہ ان کی آنکھیں اس لباس کی چمک سے چوندھیا گئی تھیں۔ اس کے اندر بھی اس زر کار لباس کو پہننے کی خواہش نے سَر اُبھارا۔ وہ ہر چہرے کی بے تابی کو اپنی خاموش نگاہوں سے پڑھ رہا تھا۔ لیکن خود وہ اب بھی بے قرار نہیں تھا۔ بادشاہ کے حکم سے وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ یہ لباس جو ملک بہروپ کے کاریگروں نے تیار کیا ہے، ہر شخص کو اس کے جسم کی پیمائش کے مطابق دربار سے دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد دربار برخواست ہوا۔

اور پھر لباس تقسیم کیا گیا۔ سب سے آخر میں اس نے بھی اپنے لیے پوشاک لی۔ ہر چھوٹا بڑا اپنے جسم پر چمک دار لباس دیکھ کر خوش ہو رہا تھا پورے شہر میں جشنِ لباس منایا گیا۔ اس نے بھی اس پوشاک کو اپنے جسم پر پہنا۔ تھوڑی دیر تک وہ

ستاروں کی طرح چمکتے ہوئے لباس کے سنہری تاروں کو دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں مسکراتا رہا۔ لیکن اچانک اسے محسوس ہوا جیسے وہ لباس تنگ ہوتا جا رہا ہے اور اس کا بدن پھول رہا ہے۔ وہ گھبرایا لیکن لباس لمحہ بہ لمحہ سکڑتا گیا اور آہستہ آہستہ وہ گناہ گار کی قبر کی طرح تنگ ہو گیا۔ اُسے لگا جیسے چند لمحوں کے بعد اس کی دونوں جانب کی پسلیاں ہاتھوں کی انگلیوں کی طرح آپس میں بھنچ جائیں گی اور اسی خوف کے سبب اس نے اپنے بدن پر چڑھے ہوئے لباس کو ہاتھوں سے نوچنا شروع کر دیا۔ لیکن لباس اور سختی سے اس کے جسم سے چپکتا گیا۔ عجیب کشمکش کا عالم تھا۔ جتنا وہ لباس کو الگ کرتا اتنا ہی سختی سے وہ لپٹ جاتا۔ بالآخر وہ کامیاب ہوا۔ اُس نے لباس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ اس جد و جہد میں اس کی سانسیں بے ترتیب ہو گئی تھیں۔ لیکن اب وہ بے لباسی میں سکون محسوس کر رہا تھا۔ لباس کے ٹکڑے اس کے چاروں طرف بکھرے پڑے تھے۔ اس کا دل لباس پہننے کی خواہش سے پاک ہو چکا تھا۔

اس نے چاہا کہ وہ اپنی قوم کے لوگوں کا حال معلوم کرے کہ کیا اُس کی طرح سب کے جسموں پر وہ تنگ ہو گیا؟ کیا انہوں نے بھی ملک بہروپ سے ملے ہوئے اس عجیب تحفے کے چیتھڑے کر ڈالے؟ وہ شہر کی سڑک پر آیا لیکن اُسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ہر شخص اس اجنبی لباس کو پہن کر فخر محسوس کر رہا تھا اور

جب لوگوں کی نگاہیں اس کے برہنہ جسم پر پڑیں تو سب ہنسنے لگے۔ بعض بچے تالیاں بجانے لگے۔ جبکہ تھوڑی دیر پہلے وہ سب بھی ننگے تھے اور اس نے محسوس کیا کہ وہ سب اسے پاگل سمجھ رہے ہیں۔

بہت جلد یہ خبر بادشاہ کے کانوں تک پہنچا دی گئی کہ اس نے لباس کو تار تار کر دیا اور اب برہنہ سڑک پر گھوم رہا ہے۔

بادشاہ کے سپاہی اسے پکڑ کر دربار میں لے گئے۔ بادشاہ نے جو زرق برق لباس زیب تن کیے ہوئے تھا، اس سے کہا کہ وہ لباس پہنے ورنہ سخت سے سخت سزا دی جائے گی لیکن اس نے لباس پہننے سے انکار کر دیا اور بادشاہ کے حکم سے اس ننگے بدن پر ایک سپاہی نے تازیانے برسانے شروع کر دیے۔ اس کے جسم پر تازیانے کی ضربوں کے نیلے نیلے نشان ابھرنے لگے۔ وہ پھر بھی حکمِ شاہی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ بادشاہ نے پھر کہا کہ اگر تو لباس نہیں پہنے گا تو جلا وطن کر دیا جائے گا .... اور پھر وہ جلا وطن کر دیا گیا۔

وہ تنہا بے یار و مدد گار صحرا بہ صحرا پھرتا رہا۔ بھوک اور پیاس کی شدّت نے اس کے بدن کو نڈھال کر دیا۔ پتھروں سے نکلتی ہوئی آگ سے اس کے پیروں میں آبلے پڑ گئے۔ لیکن اس کا دل اس لباس کو پہننے کے لیے کسی طرح آمادہ نہ ہوا۔ اسے سکون حاصل تھا ان لوگوں سے زیادہ جنہوں نے لباس پہن کر اپنی ہیئت تبدیل کر لی تھی۔ بہت دن تک وہ اسی طرح بھٹکتا رہا۔ پھر ایک دن اس کی ملاقات ایک دراز العمر بزرگ سے ہوئی کہ جن کے ابرو بھی سفید ہو چکے تھے۔ وہ ان کے قریب جا کر بیٹھ گیا اور یوں استفسار کیا:

’’اے خدا آگاہ! میں جلا وطن کر دیا گیا اس سبب سے کہ میں نے وہ لباس نہیں پہنا جو ایک غیر قوم نے ہمارے بادشاہ کو تحفے میں دیا تھا کہ وہ لباس میرے بدن پر گناہ گار کی قبر کی طرح تنگ ہو گیا تھا۔ اے پیر و مرشد کیا کیا میں گناہ گار ہوں؟‘‘

چند لمحے بعد بزرگ کی پلکوں کو جنبش ہوئی۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور کہا:

’’اور زمین پر کی چیزوں کو اس لیے باعث رونق بنا کر بھیجا تاکہ لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں زیادہ اچھا عمل کون کرتا ہے اور زمین پر کی تمام چیزیں ایک صاف میدان یعنی فنا ہو جانے والی ہیں۔‘‘

اور پھر حضرت نے اسے ایک آئینہ دیا جس کا نام مرات الغیب تھا اور جس میں ہر چیز کا حقیقی روپ نظر آتا تھا۔ اس نے دریافت کیا۔

’’اے مخزن اسرار الٰہی! اس آئینہ کا کیا مصرف ہے؟‘‘

حضرت نے فرمایا۔ ’’جا اور اسے اپنی قوم کے روبرو رکھ شاید وہ خود کو پہچان کر راہ راست پر آ جائے۔‘‘

اُس نے پھر کہا ’’اے ہادیِ زماں، اگر وہ بھٹک گئے ہیں تو آپ انہیں صحیح راستہ بتلائیے۔‘‘

اس پر حضرت نے فرمایا ’’جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پاتا ہے اور جس کو وہ بے راہ کر دیں تو آپ اس کے لیے کوئی مددگار راہ بتانے والا نہ پاویں گے۔‘‘

اتنا کہہ کر حضرت اس کی نظروں سے روپوش ہو گئے۔ اس نے مرات الغیب کو مضبوطی سے تھاما اور اپنے وطن کی جانب لوٹ گیا۔ شہر میں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ لوگوں کے جسم بہت لاغر ہو گئے ہیں اور ان پر چمکدار ڈھیلا ڈھالا لباس جھول رہا ہے۔ اسے دیکھ کر لوگوں نے پہلے سے زیادہ اس کا مذاق اڑایا۔ اسے دیوانہ سمجھ کر اس پر آواز کسے لیکن اس کے چہرے کی سنجیدگی میں ذرا بھی فرق نمایاں نہیں ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ ان لوگوں میں سے بعض کے جسموں پر وہ لباس تنگ ہو رہا ہے اور وہ اسے حسرت بھری نگاہوں سے گھور رہے ہیں۔ اسی وقت بادشاہ اپنے امرا کے ساتھ دربار میں لے گئے کہ وہ بغیر اجازت شہر میں داخل ہوا تھا۔ بادشاہ اپنے امرا کے ساتھ دربار میں موجود تھا۔ سب کے جسموں پر وہ اجنبی لباس چڑھا ہوا تھا۔ اسے برہنہ حالت میں دیکھ کر تمام درباریوں نے قہقہہ لگایا اور بادشاہ ان کے اس بے ادبانہ فعل سے خفا نہیں ہوا۔ بادشاہ

نے اس سے پوچھا ''تواب کیوں آیا ہے؟''
''میں چاہتا ہوں کہ تم سب جو اپنی راہ سے بھٹک گئے ہو، پھر وہیں لوٹ آؤ۔'' اس نے جواب دیا۔
''ہمارے اعمال و افعال کو غلط ثابت کرنے کے لیے تیرے پاس کیا ہے؟''
اس نے مرات الغیب کو سب کے روبرو رکھ دیا اور اس آئینہ میں کہ جو حقیقت بیان کرتا تھا، ان سب لباس پہننے والوں کے ننگے اور بد نما جسم نظر آئے اور وہ جو سب کی نظروں میں برہنہ تھا۔ آئینہ میں لباس زر نگار پہنے ہوئے دکھائی دیا۔ بادشاہ نے عالمِ غضب میں کہا:
''تو جادوگر ہے ......تو جھوٹا ہے ...... فریبی ہے .... لے جاؤ اسے قید خانے میں ڈال دو اسے دار پر کھنچوا دو۔''
اور جب سپاہی اسے لے جانے لگے تو اس کے چہرہ پر ذرا سا بھی خوف نہ تھا کہ حق کہنے کے جرم میں اس سے پہلے بھی لوگ دار پر چڑھائے جا چکے تھے۔
سر عام جب اسے دار پر لٹکایا گیا تو اس نے لوگوں کی بھیڑ میں ایسے لوگوں کی ایک جماعت دیکھی جن کے چہروں پر اس کی موت کا غم تھا۔ ان کے جسموں پر لباس کانٹوں کی طرح چبھ رہا تھا۔ ان کی سانسیں اس لباس کے اندر گھٹ رہی تھیں۔ ان لوگوں کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ ابھر آئی۔
***

خوف

بچّے ٹیلی ویژن دیکھنے میں محو تھے۔ بچّوں کے ایک پروگرام میں ایک لڑکی کہانی سنا رہی تھی وہ کہہ رہی تھی۔
''تو بچو ہوا یوں کہ ایک جنگل میں ایک شکاری شیر کے شکار کے لیے ایک پنجرہ لگا کر چلا گیا اتفاق سے ایک خونخوار شیر اُدھر سے گذرا، اُس نے دیکھا کہ پنجرے کے اندر ایک بکری کا بچّہ بیٹھا ہوا ہے۔ شیر کے منہ میں پانی آ گیا اور وہ بکری کے بچے کو پکڑنے کے لیے پنجرے پر جھپٹا، جیسے ہی وہ پنجرے کے اندر گھُسا، پنجرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ اب تو شیر بڑا پریشان ہوا کہ کیا کرے۔ اب وہ انتظار کرنے لگا کہ وہاں سے کوئی گذرے تو اس کی خوشامد کرے اور پنجرہ کا دروازہ کھلوائے۔ تھوری دیر بعد وہاں سے ایک لومڑی گذری، شیر نے لومڑی سے درخواست کی کہ وہ دروازہ کھول دے۔ لومڑی کہنے لگی کہ میں نے اگر دروازہ کھول دیا تو تم مجھے کھا جاؤ گے۔ شیر نے کہا۔ لومڑی کہنے لگی کہ میں نے دروازہ کھول دیا تو تم مجھے کھا جاؤ گے۔ شیر نے کہا۔ نہیں میں ایسا نہیں کروں گا۔ بہت خوشامد کرنے پر لومڑی نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔ شیر پنجرے سے باہر آ گیا، شیر کو بہت بھوک لگ رہی تھی۔ اُس نے اپنا وعدہ بھول کر لومڑی کو کھانا چاہا۔ لومڑی نے کہا یہ کیسا انصاف ہے۔ تم اپنے وعدے سے بدل رہے ہو۔ شیر بولا مجھے بھوک لگی ہے۔ لومڑی بولی اچھا چلو کسی سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ انصاف کی بات ہے۔ شیر اس بات پر راضی ہو گیا۔ تھوڑی دور پر انہیں ایک آدمی ملا۔ لومڑی نے آدمی کو روک کر ساری بات بتائی۔ آدمی کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا چلو مجھے وہ پنجرہ دکھاؤ، تینوں پنجرہ دیکھنے چل دیے۔ پنجرے کے پاس پہنچ کر آدمی نے کہا کہ مجھے یقین نہیں آتا کہ شیر اتنا بڑا ہو کر اس پنجرے میں کیسے آ گیا۔ شیر کے بار بار کہنے پر بھی آدمی نے تسلیم نہیں کیا۔ آخر کار شیر نے کہا کہ میں پنجرے کے اندر جا کر دکھاتا ہوں۔ جیسے ہی شیر دوبارہ پنجرے میں گیا آدمی نے پنجرے کا دروازہ بند کر دیا۔ اب تو شیر بہت پچھتایا۔ لومڑی کو یقین ہو گیا کہ آدمی شیر سے زیادہ خطرناک ہے۔ لومڑی نے آدمی کا شکریہ ادا کیا اور جنگل میں چلی گئی۔''
بچّے کہانی سن کر بہت خوش ہوئے۔ لیکن ننھا عاطف یہ سوچنے لگا کہ آدمی کیا ہوتا جو شیر سے بھی نہیں ڈرتا۔ اس نے پاس بیٹھی ہوئی دادی ماں سے اپنی ننّھی زبان میں معلوم کیا۔
''دادی ماں یہ آدمی کیا ہوتا ہے کہ شیر بھی اس سے ڈرتا ہے۔'' دادی ماں نے از راہ مذاق کہا۔
''آدمی بڑا خطرناک جانور ہوتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے بہت سال پہلے چنگیز خاں نام کا ایک آدمی تھا۔ بہت ہی خطرناک تھا اس نے ہزاروں گھر جلا دیے۔ سیکڑوں شہر برباد کر دیے۔ لاکھوں لوگ اس کے ہاتھوں مارے گئے۔ آدمی تو اتنا خطرناک ہوتا ہے کہ سب جانوروں کو مار سکتا ہے۔:
ننھے عاطف کے دل پر ایک خوف طاری ہونے لگا تھا۔ دوسرے بڑے بچوں کو عاطف کے خوف اور حیرانی سے لطف آ رہا تھا۔ انہوں نے دادی ماں سے کہا۔

’’دادی ماں ننھے کو یہ بھی توبتا۔ کہ ہلاکو خاں بھی آدمی تھا جس نے بغداد شہر کو جلا دیا تھا۔‘‘
’’ہاں بیٹا ہلاکو خاں بھی ایک آدمی تھا اس نے بھی ہزاروں بے گناہوں کو مار ڈالا۔‘‘
دادی ماں کو بھی لطف آ رہا تھا۔ ٹیلی ویژن اب بھی چل رہا تھا لیکن بچوں کی دلچسپی اس کی طرف سے اس لیے ہٹ گئی تھی کہ اب خبریں آ رہی تھیں۔ لیکن جب خبریں سنانے والی خاتون نے بتایا کہ ’’ایک نامعلوم آدمی نے شہر کے بیچوں بیچ بھیڑ والی جگہ پر اپنی بندوق سے اندھا دھند گولیاں چلا دیں جس سے بہت سے لوگ مارے گئے۔‘‘ تو عاطف چونک پڑا۔ اب آدمی کا ڈر اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ اس کا ننھا سا ذہن سوچنے لگا تھا کہ خدا نے آدمی کو ایسا کیوں بنایا ہے جو خوب صورت دنیا کو تباہ کر دینا چاہتا ہے۔ خبریں ختم ہو گئی تھیں۔ خبروں کے اختتام پر اناؤنسر نے ایک ضروری اعلان کیا، اس نے کہا۔ ’’جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ وزیر اعلیٰ کو کل رات کسی آدمی نے بم کے دھماکے سے اڑا دیا۔ جو شخص اس آدمی کو پکڑ وائے گا اسے دس لاکھ روپے کا انعام دیا جائے گا۔‘‘
اس اعلان نے ننّھے عاطف کے دہن پر خوف کا ایک اور وار کیا، اس کے ننّھے ذہن نے یقین کر لیا تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ خطرناک مخلوق آدمی ہے۔ وہ دل و نظر میں خوف لیے ہوئے نیند کی آغوش میں چلا گیا اور خواب میں آدم کی بھیانک شبیہ تیار کر رہا تھا۔ وہ سب کی زبانی اتنے واقعات سُن چکا تھا کہ اُسے آدمی کے مقابلے میں تمام بھیانک مخلوقات کی شکلیں کم بھیانک معلوم ہو رہی تھیں، کم سِن ذہن آدمی کے تعمیری کارناموں سے ناواقف ہوتا ہے۔ نا پختہ اذہان تخریب کاری کی جانب زیادہ متوجہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ عاطف کے دل و دماغ پر آدمی کی تخریب کاریاں نقش ہو گئی تھیں۔ اس کے ذہن میں صرف یہ تصویریں محفوظ تھیں کہ آدمی نے کسی کو قتل کر دیا، آدمی نے کسی عورت کو جلا دیا، آدمی نے راہ چلتے کسی کو لوٹ لیا، آدمی نے ہوائی جہاز اور ٹرین کو بم سے اڑا دیا۔ عاطف تمام رات خوف سے سمٹتا رہا۔
دوسرے دن جب پھر شام کا دھند لکا چھایا تو بچوں نے دادی ماں کو گھیر لیا اور کہانی سنانے کے لیے ضد کی۔ ننھّے عاطف نے اپنی توتلی زبان میں کہاں۔
’’دادی ماں آدمی کی کہانی سنائیے۔‘‘
عاطف نے یہ بات اس طرح کہی تھی جیسے بچے شیر کی کہانی کی فرمائش کرتے ہیں۔ دادی ماں نے عاطف کی فرمائش کا احترام کرتے ہوئے کہا:
’’اچھا بچو! میں تمہیں آدمی کی کہانی سناتی ہوں۔ بہت پہلے کی بات ہے۔ ایک جنگل میں ایک شیر اپنے دو بچّوں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ جب اس کے بچّے بڑے ہونے لگے تو شیر نے ان سے کہا کہ دیکھوں تم جنگل میں کسی سے نہیں ڈرنا، اس لیے کہ تم جنگل کے راجا کے بیٹے ہو لیکن آدمی سے ہمیشہ بچ کر رہنا، وہ بہت خطرناک مخلوق ہے، وہ تمہیں بھی مار سکتا ہے۔ شیر کے بچّوں نے اس بات کو ذہن نشیں کر لیا۔ ایک دن شیر کا ایک بچّہ جو اب بڑا ہو گیا تھا جنگل میں گھومنے کے لیے نکلا وہ سوچ رہا تھا کہ شاید اسے کہیں آدمی جیسی بھیانک مخلوق دیکھنے کو ملے ۰ اُس نے دیکھا کے پیڑ کے نیچے ایک گدھا کھڑا ہے شیر کے بچّے نے قریب جا کر پوچھا۔
’’تم کون ہو؟‘‘
’’کیا تم نے آدمی کو دیکھا ہے۔ وہ کیسا ہوتا ہے‘‘۔ شیر کے بچّے نے پھر سوال کیا۔ گدھا آدمی کا نام سن کر کچھ سہم گیا اور کہنے لگا۔
’’آدمی تو بڑی بُری بلا کا نام ہے۔ روزانہ صبح میری پیٹھ پر بوجھا لاد دیتا ہے اور ڈنڈے سے مار مار کر بوجھا لے چلنے پر مجبور کرتا ہے۔ میری یہ حالت اُسی نے کی ہے۔‘‘
گدھے نے اپنی پیٹھ سے بہتے ہوئے خون کو دکھایا۔ شیر کا بچہ اپنے ذہن میں آدمی کی ڈراؤنی تصویر بناتا ہوا آگے بڑھا تو اسے ایک گھوڑا دکھائی دیا۔ کم سن شیر نے سوچا شاید یہی آدمی ہے یہ گدھے سے بڑا ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ’’تم کون ہو؟ کیا تم آدمی ہو؟‘‘
’’نہیں میں تو گھوڑا ہوں۔ آدمی تو بہت ظالم ہوتا ہے۔ یہ دیکھو میرے جبڑوں کا کیا حال کیا ہے۔ میرے منہ میں لگام باندھ کر میری پیٹھ پر بیٹھ جاتا ہے اور مجھے چابک سے مار مار کر دوڑاتا ہے‘‘ گھوڑے نے اپنا منہ اور پیٹھ جوان ہوتے ہوئے شیر کو دکھائی۔ یہ سُن کر نوجوان شیر کو اطمینان ہوا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ تھوری دور چلا کہ اس کی نگاہ اونٹ پر پڑی، اونٹ کی لمبائی دیکھ کر اسے گمان ہوا کہ یہی آدمی ہو گا۔ اس نے دبے الفاظ میں پوچھا۔
’’تم کون ہو؟‘‘
’’تم میرا نام جان کر کیا کرو گے؟‘‘ اونٹ پوچھنے لگا۔ نوجوان شیر کہنے لگا۔
’’آدمی کو دیکھنا چاہتا ہوں، تم آدمی تو نہیں؟‘‘
آدمی کا نام سن کر اونٹ کے بدن میں کپکپی سی آ گئی۔ وہ کہنے لگا۔

''بھئی تم نے کس بلا کا نام لے دیا کہ جس کے نام ہی سے مجھے ڈر لگنے لگا۔ میں اونٹ ہوں۔ میں تو خود آدمی کا تابع دار ہوں۔ یہ دیکھوں آدمی نے میری ناک میں نکیل ڈال رکھی ہے اور مجھے اپنے اشاروں پر نچاتا ہے۔ میری پیٹھ پر سامان لاد کر گرم گرم ریت پر دوڑاتا ہے۔

اب نوجوان شیر سوچنے لگا کہ آخر آدمی کیسا ہو گا جو اتنے بڑے جانور کو بھی تابعدار کر رکھا ہے۔ وہ یہی سوچتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک سیاہ پہاڑ جیسے جسم وا لے جانور کو دیکھ کر ڈر گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہی آدمی ہو گا کہ جس سے سبھی خائف ہیں۔ وہ ایک درخت کی آڑ میں چھُپ گیا اور وہیں کھڑے ہو کر پوچھنے لگا۔

''اے پہاڑ جیسے بدن رکھنے والے کیا تم آدمی ہو جس سے جنگل میں سبھی ڈرتے ہیں میں نے تم سے بڑا اب تک کوئی نہیں دیکھا۔''

ہاتھی کو شیر کی معصومیت پر ترس آ یا اور اس نے کہا

''نہیں! میں ہا تھی ہوں اور تم بڑے خوش قسمت ہو کہ تم نے ابھی تک آدمی کو نہیں دیکھا۔ میرے سر کی حالت دیکھو، میرے اوپر بیٹھ کر اتنی زور زور سے بھالے مارتا ہے جیسے یہ سر نہیں پتھر ہے۔ اتنا بڑا بدن رکھنے کے باوجود بھی آدمی کے سامنے میں بے بس ہوں۔''

نو جوان شیر اب اور زیادہ پریشان تھا کہ آخرآدمی کیا ہے۔ چلتے چلتے اس نے دیکھا کہ کچھ لوگ آری سے پیڑ کاٹ رہے ہیں۔ نو جوان شیر ان کی طرف بڑھا وہ لوگ شیر کو دیکھ کر گھبرائے لیکن ہمت کر کے کھڑے رہے۔ شیر کے بچے نے قریب آ کر پوچھا۔

''کیا تم نے آدمی کو دیکھا ہے۔ آدمی کیسا ہوتا ہے؟''

لکڑہارے بھانپ گئے اس کے دل پر آدمی کا خوف غالب ہے۔ انہوں نے نوجوان شیر سے کہا کہ ''تم ذرا اپنے ہا تھ آگے بڑھاؤ''

جب معصوم شیر نے ہاتھ آگے بڑھائے تو لکڑہارے نے چیری ہوئی لکڑی کے بیچ میں انہیں پھنسا دیا اور کہا۔

''ہم ہی آدمی ہیں۔''

نا سمجھ شیر تکلیف سے تڑپنے لگا اسے یقین ہو گیا کہ واقعی یہ آدمی ہیں۔ ''تو بچو سنا تم نے آدمی کیا ہوتا ہے۔''

ننھا عاطف دادی ماں کی یہ بات سن کر حیران تھا، دادی ماں اتنا کہہ کر خاموش ہو گئیں۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ آفاق جلدی سے دروازے پر گیا اور واپس آ کر کہا۔

''پاپا دروازے پر کوئی آدمی ہے۔''

ننھے عاطف نے آفاق کی بات کو غور سے سنا، وہ چیخ پڑا ''آدمی'' اور بے ہوش ہو گیا۔

***

تیسری دُنیا کے لوگ

رات قبر کے اندھیرے کی طرح تاریک اور خاموش تھی۔ چہار طرف مہیب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ تھکے ہارے جسم زلفِ شب کی گھنی چھاؤں میں پناہ لے کر عالمِ خواب میں مست و سرشار تھے کہ اچانک چاروں سمتیں شفق کی طرح سرخ ہو گئیں۔ رفتہ رفتہ وہ تمام روشنیاں نزدیک آتی گئیں۔ ایک ہجوم تھا جو طوفانی لہروں کی طرح بڑھ رہا تھا۔ موجوں کے شور کی سی آوازیں اس روشنیوں کے ہجوم سے اٹھ رہی تھیں۔ وہ روشنیاں شعلے اُگلتی ہوئی مشعلیں تھیں۔ جب وہ خوفناک آوازیں نکالتا ہوا ہجوم بستی کے نزدیک آیا تو انہوں نے آگ برساتی ہوئی مشعلوں کو مکانوں کے اُوپر پہنچا دیا اور چلّانے لگے۔

''مارو....ختم کر دو..... بھاگو........ چھوڑو.....یہ زمین ہماری ہے ..... یہاں صرف ہم رہیں گے ......ہماری زمین خالی کرو.......''

یہ آوازیں شعلوں کو بھڑکا رہی تھیں اور شعلے لمحہ بہ لمحہ آسمان سے ہم کنار ہوتے جا رہے تھے۔ جلتے ہوئے مکانوں کے خوابیدہ مکیں شب خون نے بچنے کے لیے اپنے مکانوں سے باہر نکلے کہ ان پر حملہ آوروں نے تیر برسائے جوان نہتے اور بے گھر افراد کے جسموں کو چیرتے چلے گئے۔ بچوں، عورتوں اور مردوں کی مظلوم چیخوں نے فضا کو ماتم کدہ بنا دیا۔ ذرا سی دیر میں پوری بستی جل کر راکھ اور چنگاریوں میں تبدیل ہو گئی اور ایسا شمشان بن گئی جہاں زندہ لوگوں کی ارتھیاں

جلائی گئی ہوں۔ جب اس ہجوم کے افراد کو یقین ہو گیا کہ اب ان جلے ہوئے مکانوں میں سوائے سسکیوں کے کوئی زندہ آواز نہیں، جو سر بغاوت بلند کر سکے تو وہ سب وہاں سے صبح کے تاروں کی طرح غائب ہو گئے اور جب آفتاب نے اپنے رُخ پُر نور سے نقاب ہٹائی تو لہو کی سُر خی پوری جلی ہوئی مُردہ بستی پر پھیل گئی۔ اس وقت ان لوگوں نے جو اس شب خون سے بچ گئے تھے آفتاب کی روشنی میں اپنے جلے ہوئے گھروں اور مُردہ عزیزوں کو دیکھا۔ وہ نام نہاد زندہ لوگ تعداد میں اس قدر کم تھے کہ انگلیوں پر شمار کیے جا سکتے تھے۔ وہ سب بے یارو مددگار، مجبور و لا چار اپنے ٹوٹے ہوئے جسموں کو ہمت کی بیساکھیوں کے سہارے اُٹھا کر یکجا ہوئے۔ زید نے یوں استفسار کیا۔

’’کیا تم لوگوں میں سے کوئی جانتا ہے کہ میرا گھر کہاں ہے؟ میرے بچّے کہاں چلے گئے ہیں؟‘‘

’’ہاں! رات کے اندھیرے میں مشعلوں کی تیز روشنی میری آنکھوں کی روشنی لے گئی۔‘‘

’’کتنا اچھا ہوتا کہ تمہاری طرح آگ کے شعلے میری آنکھوں میں بھی اُتر جاتے اور میری بینائی بھی ختم ہو جاتی...‘‘ حارث نے پُر درد لہجے میں اظہار افسوس کیا۔

’’تم ایسا کیوں سوچتے ہو...آنکھیں خدا کی نعمت ہیں۔‘‘ زید اپنی محرومی پر ملول ہوا۔

’’اے زید تم بہت خوش قسمت ہو کہ تم دیکھ نہیں سکتے اور میں کتنا بدقسمت ہوں کہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔‘‘

’’تم کیا دیکھ رہے ہو؟‘‘ زید نے پھر سوال کیا۔

’’کیا تم سن سکو گے؟‘‘

’’ہاں! اب صرف سننے کی طاقت تو باقی بچی ہے، تم بیان کرو۔‘‘

’’میں دیکھ رہا ہوں، میرا گھر جل چکا ہے۔ اُس کی راکھ سے اب بھی دھواں اُٹھ رہا ہے۔ میرا باپ میری ماں اور میری بیوی کے جسم آگ کے شعلوں کی نذر ہو چکے ہیں۔ میرے بچّوں کے جسم خون میں لتھڑے ہوئے ہیں‘‘

’’خدا تمہیں صبر عطا فرمائے۔‘‘ زید نے دعا دی۔

’’صبر کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔‘‘

’’کیا تم میرے گھر اور بچوں کے بارے میں بتا سکتے ہو۔‘‘ زید آنکھوں کی تکلیف بھُولے ہوئے تھا۔

’’کس کا گھر...کس کے بچّے ... یہاں تو کوئی گھر نہیں ...کسی کے بچے نہیں ہیں۔‘‘

’’کیا سب کچھ ختم ہو گیا؟‘‘

’’نہیں ابھی تو سب کچھ موجود ہے۔ جلے ہوئے مکانوں کی راکھ ختم نہیں ہوئی ہے۔ سب کی لاشیں ابھی یہیں موجود ہیں۔ اٹھائے گا بھی کون انہیں۔ کون انہیں دفن کرے گا۔ دفن کرنے والے خود انہیں لاشوں میں دبے ہوئے ہیں۔ ہاں جانور کھائیں گے۔ اب تو آنے بھی لگے ہیں۔‘‘

’’اور تم دیکھ رہے ہو؟‘‘ زید نے غصّہ میں کہا۔

’’کر بھی کیا سکتا ہوں۔‘‘

’’انہیں لاشوں سے دور کرو۔‘‘

تم سمجھتے ہو ہم سب زندہ ہیں۔ نہیں ہم سب بھی تمہاری طرح مر چکے ہیں۔ ہمارے جسم آدھے جسم ہیں۔ گزشتہ رات سب کو اَدھُورا کر گئی ہے۔‘‘

’’معاف کرنا میں نے تم پر غصّہ کیا۔‘‘ زید کو اپنے غصّہ پر شرمندگی کا احساس ہوا۔ ’’افسوس کیوں کرتے ہو۔ ہم سب کے پاس اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ ایک دوسرے پر غصہ کر کے دل کا بوجھ ہلکا کریں۔‘‘

زید خاموش ہو گیا، پھر اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔

وہ سب اَدھُورے لوگ سوچ رہے تھے کہ اب کیا کریں کہ ایک نوجوان نے کہا:

’’چلو! ہم سب ان لوگوں سے انتقام لیں۔‘‘

’’تم ایسا نہیں کر سکو گے کہ تم تعداد میں ۷۲ بھی نہیں۔‘‘ ضعیف العمر مونس نے کہا۔

’’پھر ہم کیا کریں۔‘‘ ان سب نے سوال کیا کہ ان کے ذہن مفلوج ہو چکے تھے فیصلہ کرنے کی قوت ختم ہو گئی تھی۔ سب خود کو محتاج ومعذور محسوس کر رہے تھے۔

’’ہم سب اپنے پڑوس کی بستیوں میں چلیں اور حال بیان کریں۔ شاید ہماری مصیبتوں کا کچھ حل نکلے اور ہمیں پتہ ملے۔‘‘

سب نے متفقہ طور پر اس رائے کو تسلیم کیا اور وہ حیرت و یاس سے جلے ہوئے مکانوں اور جسموں کو دیکھتے ہوئے وہاں سے چل دیے۔ کچھ دور پہنچے تھے کہ ایک تباہ حال مختصر سے قافلے سے ملاقات ہوئی۔ بوڑھے مونس نے معلوم کیا کہ تم لوگ اس حال کو کس طرح پہنچے۔ انہوں نے وہی حال بیان کیا جوگزشتہ رات اُن پر بھی گزر چکا تھا۔ ان کے گھروں اور ان گھروں میں رہنے والے افراد کو بھی زندہ جلایا گیا تھا۔ سب نے اظہار افسوس کیا۔ اور وہ کر بھی کیا سکتے تھے کہ سب کا

حال ایک ہی تھا۔ چند ساعت نہ گزریں تھیں کہ ایک اور قافلہ ان سے آ ملا۔
پھر ایک اور۔
ایک اور۔
ایک اور۔
وہ سب ہی اپنی بستیوں کی راکھ کو سلگتا ہوا اور عزیزوں کے جسموں کو بے کفن چھوڑ کر آئے تھے۔
اب پھر وہی مسئلہ پیدا ہوا گیا تھا کہ اب کیا کریں۔ کہاں جائیں۔ بچے ہوئے نوجوانوں کا جوش انتقام لینے کیے لیے اُکسا رہا تھا، لیکن معمر اور بزرگ لوگ بچوں اور عورتوں کی موجودگی میں انہیں اس فعل سے روک رہے تھے کہ اس میں اپنی ہی تباہی ڈر تھا۔
بہت دیر تک وہ سب سوچتے رہے اور پھر وہ اس بات پر تیار ہو گئے کہ ہم اپنے ملک واپس چلیں کہ جہاں سے چند برس پہلے یہاں آئے تھے۔ شاید ہمیں اپنے پرانے مکان مل جائیں۔ اسی امید کو لے کر وہ اپنے ملک کی سرحد کی طرف چل دیے لیکن جب وہ اپنے ملک کی سرحد پر پہنچے تو سرحد داروں نے انہیں روک دیا کہ اب تم لوگ اس ملک میں نہیں آ سکتے۔ یہ ملک اب تمہارا نہیں رہا۔
''پھر ہم کہاں جائیں؟ جس ملک میں ہم پناہ تلاش کرنے کے لیے آئے تھے، وہاں کے لوگوں نے ہمیں پناہ نہیں دی۔ ہمارے گھروں کو جلا دیا۔ ہمارے بھائیوں کو جانوروں کی طرح قتل کر ڈالا۔''
''ہم نہیں جانتے کہ تم کہاں جاؤ، لیکن ہمارے ملک کے راستے تمہارے لیے بند ہیں۔ تم جہاں چاہو جا سکتے ہو۔ دُنیا بہت بڑی ہے۔'' سرحد داروں نے تلخ لہجہ میں کہا۔
''لیکن دنیا ہمیں اس لیے قبول نہیں کرتی کہ ہم تمہارے ملک کے رہنے والے ہیں۔''
''تمہارا اب اس ملک سے کوئی تعلق نہیں یہاں سے جاؤ۔ جہاں جا سکتے ہو سمندر کی لہریں بڑے بڑے قافلوں کی پناہ دینے کے لیے تیار ہیں''
سرحد داروں نے انہیں دھُتکار دیا، اور وہ بے گھر افراد مایوس ہو کر وہاں سے لوٹ گئے۔ بہت دن تک وہ اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے۔ جنگلوں اور پہاڑوں میں پناہ ڈھونڈنے لگے۔ لیکن اُن لوگوں نے کہ جنہوں نے اُن کے گھروں کو جلایا تھا، اس دشت نوردی میں بھی سکون نہ لینے دیا۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد اور کم ہوتی چلی گئی اور جب وہ ہر طرف سے مجبور و لاچار ہو گئے تو سرحد دار کی اس بات پر غور کرنے لگے کہ کیا واقعی سمندر کی لہریں ہماری آخری پناہ گاہ ہیں۔ ان سب نے پھر فیصلہ کیا کہ بہتر ہے کہ ہم سب لوگ خود کو سمندر کے حوالے کر دیں۔ شاید زمین ہمارے لیے تنگ ہو چکی ہے۔ اور یہ سوچ کر سب نے سمندر کی راہ لی۔ سمندر کی طوفانی لہروں کو دیکھ کر خوف محسوس ہوا، لیکن اپنی بے کسی اور بے بسی کو یاد کر کے اس خوف کو مغلوب کیا اور جب ان سب نے خود کو سمندر کی لہروں کے حوالے کرنے کے لیے تیار کر لیا تو ایک آواز آئی۔
''ٹھہرو! تم سب بزدل ہو کیا تم نہیں جانتے خودکشی کرنا حرام ہے۔''
سب نے مڑ کر دیکھا ایک دراز العمر، سفید ریش بزرگ ان سے مخاطب تھا۔
''ہاں۔ ہم جانتے ہیں لیکن خدا کی یہ زمین ہم پر تنگ ہو چکی ہے اور آسمان سے ہمارا رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ ہم اپنے معصوم بچوں کو ذبح ہوتے ہوئے اور عزیزوں کے جسموں کو آگ میں جلتے ہوئے نہ دیکھ سکے اور خدا دیکھتا رہا۔ ہم نے آسمان سے رحم کی بھیک مانگی لیکن ہمارے دامن میں دہکتے ہوئے انگارے آئے۔ اب ہم کیوں آسمانی احکامات پر عمل کریں۔ اب سوائے اس سمندر کے ہمارے لیے کوئی پناہ گاہ نہیں۔ کیا خدا نہیں جانتا کہ ہم پریشان حال ہیں؟'' سب نے بہ یک آواز کہا۔
''خدا سب کچھ جانتا ہے۔ اسی لیے اس نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے کہ میں تمہاری رہبری کروں، تمہیں صحیح راستہ بتلاؤں۔''
''نہیں، اب ہمیں کسی کی رہنمائی کی ضرورت نہیں۔ اُس وقت تم کہاں تھے جب ہماری عورتوں اور ہمارے بچّوں کے بدن دہکتی ہوئی آگ میں جھلس رہے تھے اور ان کی چیخیں آسمان سے ٹکرا رہی تھیں۔ کیا تم نے کبھی اپنے دل کے ٹکڑوں کو آگ میں جلتے ہوئے دیکھا ہے اس وقت کے کرب کو محسوس کیا ہے۔ شاید جہنم کا منظر بھی اتنا کربناک نہیں ہو گا کیوں کہ وہاں کوئی شخص اپنے جلتے ہوئے عزیز کو پہچانے گا نہیں۔ بہتر ہو گا کہ تم ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ۔ ایسا نہ ہوکہ ہم کوئی گستاخی کر بیٹھیں۔'' وہ سب غصّہ کی حالت میں کانپ رہے تھے۔
''تم ابھی غصہ میں ہو اور جو کچھ کر رہے ہو اس کے انجام سے ناواقف ہو۔'' اس بزرگ کے لہجہ میں شفقت تھی۔
''تم نا فہم ہو۔ تم چاہتے ہو کہ تمہارے بعد اور بستیاں جلیں اور تمہاری طرح ان بستیوں کے لوگ بھی خود کو سمندر کے حوالے کر دیں اور یہ سلسلہ چلتا رہے۔''

’’آخر تم چاہتے کیا ہو؟ اگر خدا ہماری مدد نہیں کرتا تو ہمارے فعل سے ہمیں روکتا کیوں ہے؟‘‘ ان کے غصّے میں جھنجھلاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔
’’یہ زمین تو لوگوں کے لیے بنائی گئی لیکن تم نے اسے بانٹ لیا۔ تم نے اس زمین پر خونریزی کی، شر پھیلایا، کیا اب بھی تم خدا سے امید کرتے ہوکہ وہ تمہاری مدد کرے گا۔ اس نے تمہیں زمین پر خود مختار بنایا، پھر وہ کیوں تمہاری مدد کرے‘‘
’’اپنے اسی اختیار کو استعمال کرتے ہوئے ہم خود کشی کر رہے ہیں۔‘‘
’’لیکن خودکشی کرنا زندگی سے فرار ہے اور زندگی سے فرار کم ہمتی اور بُزدلی ہے۔ کیا تم بزدل ہو؟‘‘
پیر مرد نے استفسار کیا۔
’’نہیں۔ لیکن ہم مجبور ہیں۔‘‘
’’مجبوری کم ہمتی کا دوسرا نام ہے۔ جاؤ اپنا حق مانگو۔ یہ زمین تم سب کے لیے ہے۔‘‘
’’لیکن ہم تعداد میں کم ہیں اور بے یار و مددگار ہیں۔‘‘
’’تم تین سو تیرہ سے زیادہ ہو۔ کیا تم تین سو تیرہ کی فتح کے بارے میں نہیں جانتے۔ وہ سب بھی بے یارومددگار تھے۔‘‘
پیر مرد کی باتیں سُن کر سب نے گردن نہیں جھُکا لیں کہ وہ سب نادم تھے اور جب انہوں نے ندامت کے بوجھ سے دبی ہوئی گردنیں اٹھائیں تو اس بزرگ کو وہاں موجود نہیں پایا۔ لیکن ان کے مضمحل چہروں پر تازگی اور جوش پلٹ آیا تھا۔ سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بلند آواز سے کہا۔
’’آؤ ہم سب اپنے جلے ہوئے مکانوں سے نئے مکان پیدا کریں ہم سب ان کے خلاف جنگ کریں، جنہوں نے زمین کو بانٹ لیا ہے۔ زمین ہم سب کی ہے۔‘‘ اور اس نئے عزم کے ساتھ وہ سب اپنی بستیوں کی طرف لوٹ گئے۔
***

سُوئٹ ہوم

’’پھر ابراہیم کے لیے خدائے بزرگ و برتر کا حکم ہوا ہے کہ اے ابراہیم تم اپنی بیوی اور معصوم بچّے کو اللہ کی راہ میں قربان کر دو۔ ابراہیم نے اللہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ہاجرہ بی بی سے کہا کہ اے ہاجرہ تم اسمٰعیل کو لے کر میرے ساتھ چلو۔ وہ نیک بی بی بغیر کچھ سوال کیے ابراہیم کے ہم راہ چلنے لگی۔ جب وہ تینوں ایک ریگستان میں پہنچے جہاں تپتی ہوئی ریت کے سوا کچھ بھی نہ تھا تو ابراہیم ان دونوں کو چھوڑ کر جانے لگے۔ ہاجرہ بی بی نے پکار کر کہا ’’اے میرے سرتاج ہمیں کس کے سہارے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔‘‘ ابراہیم نے کوئی جواب نہ دیا، انہوں نے پھر سوال کیا کہ ’’کیا ہم سے کوئی بھول ہوئی‘‘ ابراہیم نے کہا ’’نہیں! یہ میرے اللہ کا حکم ہے۔‘‘ بی بی ہاجرہ نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ ابراہیم وہاں سے رخصت ہوئے۔ کچھ دیر بعد بچّہ پیاس کی شدت سے بلکنے لگا ہاجرہ بے چین ہوئیں کہ وہاں دُور دُور تک کوئی چشمہ نہیں تھا۔ حیران و پریشان پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑتی رہیں۔ بچّہ ریت پر ایڑیاں رگڑتا رہا، یہاں تک کہ اُسی جگہ سے ایک چشمہ پھُوٹ نکلا۔ ہاجرہ بی بی جب نامراد و مایوس واپس لوٹیں تو یہ دیکھ کر حیران ہوئیں کہ اسمٰعیل کے ایڑیاں رگڑنے سے میٹھے پانی کا چشمہ جاری ہو گیا ہے۔ تا حد نگاہ پھیلے ہوئے ریگستان میں وہ چشمہ ایک نعمت تھا۔ پھر دھیرے دھیرے وہاں لوگ آ کر بسنے لگے اور ایک ایسی بستی آباد ہو گئی جو قیامت تک آباد رہے گی۔‘‘
دینیات کی کتاب کا یہ سبق پڑھتے پڑھتے سعیدہ نے بستر پر لیٹے ہوئے شوکت سے سوال کیا۔
’’پاپا کیا ہمارا گھر ٹوٹ جائے گا؟ کیا یہ بستی اُجاڑی جائے گی؟‘‘
معصوم سعیدہ نے شوکت کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس نے تڑپ کر کہا ’’نہیں بیٹے کی ایسی بُری بات زبان سے نہیں نکالتے۔ خُدا سے دعا کرو کہ کبھی کسی کا گھر نہ اُجڑے۔‘‘ اُسے یاد آیا کہ گاؤں میں جب اُس کے چھوٹے بھائی نے روشن دان سے ایک چڑیا کے گھونسلے کو نکال کر پھینک دیا تھا تو اس نے اسے بہت ڈانٹا تھا اور سزا دی تھی لیکن آج وہ اپنے گھونسلے کے تنکوں کو بچانے میں لگا ہوا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس نے کتنی محنت و مشقّت کے بعد، ہزاروں خواہشوں کا خون کر کے اس چھوٹے سے گھر کو تعمیر کیا تھا۔
پندرہ سال قبل شوکت دہلی آیا تھا یہاں اسے ایک ملازمت مل گئی تھی۔ کچھ دن تو اپنے کسی دوست کے کمرے پر رہ کر گذار دیے تھے لیکن جلد ہی اُس نے کرائے کا ایک مکان تلاش کر لیا تھا۔ مکان حاصل کر لینے کے بعد وہ اپنی بیوی اور بچّی کو بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا کہ اب اس کا کسی اور شہر میں ہجرت کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ وقت گزرتا رہا اور وہ کئی برسوں تک

کرائے کے مکان میں رہتا رہا۔ جس مکان میں اس کی رہائش تھی اسے صرف دہلی میں مکانوں کی قلّت کے پیش نظر مکان کہا جا سکتا تھا، اس کے باوجود اس کی تنخواہ کا چوتھائی حصہ مکان کے مالک کی نذر ہو جاتا تھا۔ تنخواہ کا یہ حصہ نکالتے وقت اسے ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے اس کی خوراک کا چوتھائی حصہ چھین لیا ہو لیکن مالک مکان کی نظریں ہر ماہ رقم کی وصولی کے وقت یہ شکایت کرتی تھیں کہ ہم نے تمہیں دہلی جیسے شہر میں رہنے کے لیے چھت عطا کی لیکن تم نے اس کے عوض میں اتنی حقیر رقم دی۔ اس لیے تم مکان خالی کر دو یا کرایہ میں اضافہ کرو۔ انہیں شکایتوں کے سبب اس نے کئی مکان تبدیل کیے، وہ اس نقل مکانی سے تنگ آ گیا تھا لیکن بے بس تھا وہ اکثر اپنے آبائی گھر کی وسعت کو یاد کرتا تھا کہ جس کے صحن میں بآسانی بچے کرکٹ کھیل سکتے تھے اور جس میں رہنے کے لیے افراد کی کمی تھی۔ وہ سوچتا تھا کاش سائنس نے اتنی ترقی کی ہوتی کہ آدمی اپنا گھر جہاں چاہے منتقل کر سکے۔ اسے اپنے بچوں کے بچپن پر رحم آتا تھا کہ اُن کے بچپن میں مکانوں سے صحن غائب ہو گئے تھے۔ اسے اپنا بچپن یاد تھا اور اپنے گھر کا وہ صحن جس میں نیم کے درخت کی چھاؤں میں دوپہر گزرتی تھی۔ ساون میں آنگن کے ان درختوں پہ جھُولے جھولے جاتے تھے۔ اسے وہ اپنے بچوں کی بد قسمتی ہی کہتا تھا کہ انہوں نے گھر کے آنگن میں نہیں بلکہ صرف سڑکوں کے اطراف درخت دیکھے تھے۔ وہ یہ سب بے بسی سے سوچتا، دیکھتا اور محسوس کرتا تھا کہ سوچنا، دیکھنا اور محسوس کرنا اس کے اختیار میں تھا۔

مکانوں کی پریشانیاں دیکھتے ہوئے اکثر دوستوں نے اسے مشورہ دیا کہ اب تو تمہیں یہیں رہنا ہے کیوں نا کچھ زمین خرید کر اپنا گھر بنا لو، لیکن اس کے پاس یک مشت اتنی رقم نہیں تھی کہ تھوڑی بہت بھی زمین خرید سکتا۔ پھر بھی اس نے غفلت نہیں برتی۔ دن رات سوچتا رہا کہ کسی طرح اتنی رقم جمع کی جائے کہ کم از کم پچاس گز زمین ہی وہ اپنے لیے خرید لے، وہ تنہا کرائے کے مکان میں زندگی گذار سکتا تھا لیکن بیوی اور بچوں کی موجودگی میں اسے شرمندگی کا احساس ہوتا تھا کہ وہ انہیں اپنا گھر بھی نہیں دے سکا۔

پھر ایک دن شوکت کی زندگی کا وہ خوش نصیب دن بھی آ گیا تھا جب وہ دہلی میں سو گز زمین کا مالک ہو گا۔ اس دن اس کی بیوی اور بچے بھی بہت خوش تھے۔ اس نے اپنے دوستوں کو اس خوشی میں شریک کرنے کرنے کے لیے مٹھائی بھی کھلائی تھی۔ لیکن ابھی صرف ایک مرحلہ طے ہوا تھا ابھی خوشی ادھوری تھی۔ ابھی اس زمین پر گھر تعمیر کرنا تھا اور جو کچھ اس کے پاس تھا وہ سب زمین کی نذر ہو گیا تھا، ابھی ایک بار اور دائمی سکون کے لیے اسے گھٹ گھٹ کر جینا تھا اور وہ اس کے لیے تیار بھی تھا کہ اس مرحلے کے طے ہو جانے کے بعد وہ مطمئن زندگی گذار سکے گا۔ پھر پہلے کی طرح وہ مرکب ہمت پر سوار ہوا اور گھر کی تعمیر کی ابتدا کرا دی۔ جیسے جیسے گھر کی دیواریں بلند ہوتی گئیں، اس کے اخراجات میں تنگی آتی گئی۔ بیوی کے سبھی زیورات جنہیں ہر عورت بے حد عزیز رکھتی ہے، گھر کی تکمیل کے لیے فروخت ہو گئے۔ والدین سے مدد لی، دوستوں سے قرض لیا تب کہیں جا کر اس کے گھر کو وہ شکل ملی جس میں وہ اپنے بچوں کے ساتھ زندگی گذار سکے۔ اور جب اس گھر میں شوکت نے اپنے بچوں کے ساتھ قدم رکھا تھا تو اس نے محسوس کیا تھا کہ اب اس کی زندگی کے بقیہ دن اطمینان سے گذر جائیں گے۔ اب اسے اپنے بچوں کے سامنے شرمندگی نہیں ہو گی، سب خوش تھے بہت خوش۔ شاید کوئی بادشاہ بھی قلعے کی تعمیر کے بعد اتنا خوش نہ ہوا ہو گا اس لیے کہ وہ کئی قلعے بنوانے کی استعداد رکھتا ہے اور شوکت کو اس چھوٹے سے گھر کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنا پڑا تھا لیکن اس قربانی کے بدلے اسے کبھی نہ ختم ہونے والا سکوں نصیب ہوا تھا۔ اب اسے تھوڑے بہت قرضے کی ادائیگی کے علاوہ کوئی فکر نہ تھی۔۔ اچانک ایک دن فکروں کی یلغار ہوئی۔ ہوا یوں کہ جس زمین پر وہ بستی آباد تھی وہ دہلی ترقیاتی کمیٹی کی خریدی ہوئی زمین تھی اور کچھ شر پسند لالچی لوگوں نے اسے فروخت کر دیا تھا۔ اب یہ کمیٹی اپنا قبضہ چاہتی تھی تاکہ وہاں قومی شاہراہ بنائی جائے، پارک بنائے جائیں۔ اس نوٹس کے جاری ہوتے ہی اس بستی کے لوگ ان بے بس چھوٹے چھوٹے کمزور جانوروں کی طرح پریشان ہو گئے جو جنگل میں شیر کی آمد سے سہم جاتے ہیں۔ شوکت کی خوشیاں ختم ہو گئی تھیں، ابھی تو اس نے قرض لیے ہوئے روپے بھی واپس نہیں کیے تھے۔ بیوی کے زیورات کی واپسی کے بارے میں تو ابھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا وہ تو دیواروں پر بچوں کی لگائی ہوئی ان تصویروں کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا جن پر لکھا تھا۔ ویلکم۔ سوئٹ ہوم۔

اسے اب اس سوئٹ ہوم کی دیواریں ہلتی ہوئی نظر آ رہی تھیں اور ان ہلتی ہوئی دیواروں کے بیچ جب وہ اپنے معصوم بچوں کو ایک بار پھر بے گھری کے عالم میں دیکھتا تو تڑپ اٹھتا تھا۔ ان بچوں نے اس گھر کے لیے کتنی قربانیاں دی تھیں، کھلونوں کے بجائے گھر کے لیے اینٹیں خریدی تھیں۔ اپنے آپ کو کھلونوں سے کھیلنے والے بچوں کی عمر سے بلند کر لیا تھا اور اس معصوم بڑپن نے بازاروں میں بکتے ہوئے کھلونوں کی طرف سے منہ پھیر لیا تھا تاکہ انہیں سر چھپانے کے لیے اپنی چھت مل جائے۔ اس سے اپنی بیوی کی خالی خالی ویران آنکھیں نہیں دیکھی جاتی تھیں جس نے اپنے جسم کے تمام زیورات اتار کر مٹی کی نذر کر دیے تھے اور اس گھر کو ہی اپنا زیور سمجھا تھا۔ اسے خود اپنی خبر نہیں تھی کہ گھر کی دیوار کو بچانے کی کوشش میں اس کے بالوں میں کتنی دھول اَٹ گئی ہے اور اس کے پیر کتنے کیچڑ میں دھنس گئے ہیں۔ اس بستی کے ہر شخص

کا یہی حال تھا، سبھی لوگ اپنے گھروں کی حفاظت میں جان و مال سے لگے ہوئے تھے۔ ہر روز کسی برسراقتدار شخص کے روبرو اپنی عرضی لے کر جاتے تھے اور اس کے محض ہمدردانہ الفاظ سن کر لوٹ آتے تھے۔ ان کا رکسی نے نہیں کیا لیکن روکا کسی نے نہیں۔ پھر ایک دن یہ ہوا کہ بہت سویرے بڑی تعداد میں مسلح فوج نے بستی کو گھیر لیا اورجبراً گھروں کو خالی کرادیا۔ گھروں کے خالی ہوتے ہی بلڈوزروں کی کرخت آوازیں سنائی دیں اور تھوڑی ہی دیر میں ان دل شکن آوازوں کے ڈھیروں کے نیچے ارمانوں کے محل چکنا چور ہو گئے وہ سب اپنے ٹوٹے پھوٹے سامان کے ڈھیروں پر کھڑے اپنی بے گھری کا تماشا دیکھتے رہے۔ فوج مزاحمت کرنے والوں کے سینوں کی طرف بندوقوں کا رخ کیے کھڑی تھی۔ وہیں کچھ دور ایک شخص اپنے ٹرانسسٹر پر یہ گیت سن رہا تھا۔ ''اب کوئی گلشن نہ اجڑے اب وطن آزاد ہے۔'' اور وہیں اینٹوں کے ڈھیر پر معصوم سعیدہ کی دینیات کی کتاب کا وہ ورق کھلا ہوا تھا جس میں تحریر تھا کہ ''پھر ابراہیم کے بنائے خدا کے گھر کو ڈھانے کیے لیے ابرہہ کی ایک فوج نے مکہ پر چڑھائی کی لیکن اسی وقت آسمان پر بے شمار ابابیلیں اپنی چونچوں میں کنکریاں لیے دکھائی دیں۔ ابابیلوں نے وہ کنکریاں فوج کے اوپر برسائیں جو سپاہیوں کے سروں کے اندر اتر گئیں۔'' سعیدہ نے آسمان کی جانب دیکھا لیکن آج بندوقوں کے خوف سے ابابیلوں نے اپنا رخ بدل لیا تھا۔

***

قِصّہ صِرف کتابوں کا

بندرگاہ پر مسافروں کی بھیڑ تھی۔ آہستہ آہستہ مسافر جہاز میں سوار ہو رہے تھے، یوسف بھی اس بار چھُٹّیوں میں گھومنے کے لیے نکلا تھا اس کی بیوی، تین بچّے اور ایک بھائی اس کے ہم راہ تھے۔ بچّوں کی خواہش تھی کہ سمندر کا سفر کریں کہ انہوں نے صرف کتابوں میں سمندری سفر کے قصّے پڑھے تھے۔ یوسف نے بہت سمجھایا کہ سمندر کا سفر بہت خطرناک ہوتا ہے۔ سمندر میں طوفان آ جائے تو جہاز غرق ہو جاتے ہیں اور اس سفر میں وقت بھی بہت لگتا ہے، لیکن سب کی ضد کے آگے اسے خاموش رہنا پڑا۔ جہاز میں سوار ہونے کے بعد وہ سب بہت خوش تھے۔ جہاز کے سفر کا یہ پہلا اتفاق تھا جہاز کیا تھا ایک چھوٹا سا شہر آباد تھا، ضرورت کی تمام اشیاء وہاں دستیاب تھیں۔ پھر جہاز کا لنگر کھولا گیا اور جہاز نے حرکت کی۔ وہ اس سفر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ تا حد نگاہ لہراتا ہوا پانی دیکھ کر خوف بھی محسوس ہوتا تھا۔ جہاز دھیرے دھیرے سمندر کے سینے کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ آفتاب غروب ہونے لگا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سمندر میں ڈوب رہا ہے۔ شام ڈھلتے ہی ماہتاب کی کرنوں نے لہروں سے کھیلنا شروع کر دیا پورے سمندر پر چاندنی بکھر گئی۔ یوسف کے بچوں نے اس سے کہا۔

''ابّو ہمیں کوئی قصّہ سنائیے۔''

بچّوں کے بے حد اصرار پر اس نے ایک قصّہ بیان کیا:

''بہت پہلے کی بات ہے شہر میں ہارون نام کا ایک شخص رہا کرتا تھا اس کے والدین گذر چکے تھے۔ ہارون کے دو چھوٹے بھائی تھے جو اسی کے ساتھ رہتے تھے۔ گھر میں اس کی بیوی او چار بچّے بھی تھے۔ وہ بہت خوش حال زندگی گذار رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ سب سیر و تفریح کے لیے گھر سے نکلے۔ شہروں میں گھُومے پھرے۔ اسی دوران دریا کا سفر پیش آیا۔ ہارون اپنے بچّوں اور بھائیوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہوا کہ دریا پار کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ کشتی لہروں کے دوش پر جھولتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ ملّاحوں نے پتوار کے ساز پر گیت چھیڑ دیا۔ گیت کی آواز سناٹے میں گونج رہی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ اچانک ملاحوں کا گیت بند ہو گیا۔ شاید آنے والے خطرے نے ساز کے تاروں کو توڑ دیا تھا، انہوں نے محسوس کیا کہ کہیں سے پانی کشتی کے اندر آنے لگا ہے اور کشتی کا بوجھ دھیرے دھیرے بڑھتا جا رہا ہے۔ ملّاح فکر مند ہوئے اور پانی کو روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن پانی کو روکنا مشکل ہو گیا۔ پانی کے وزن سے کشتی آہستہ آہستہ ڈوبتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ اپنی تمام کوششوں کے باوجود ملّاح پانی کو روکنے میں ناکام رہے۔ اب کشتی کو ڈوبنے سے بچانے کے لیے ان کے پاس صرف ایک راستہ تھا وہ یہ کہ کشتی میں موجود وزن کو کم کیا جائے، پہلے تو خود سبھی ملّاح دریا میں اُتر کر کشتی کے کنارے کنارے تیر نے لگے۔

اب صرف ایک ملّاح کشتی میں باقی تھا۔ لیکن کشتی پھر بھی پانی میں ڈوب رہی تھی۔ اب ملّاح نے اعلان کیا کہ کشتی کو

بچانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ میں سے کوئی ایک دریا میں کود جائے۔ یہ سُن کر ہارون اور اس کی بیوی حیران و پریشان ہوئے۔ ان کا ذہن کوئی فیصلہ کرنے سے معذور سا ہو گیا تھا، دونوں ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر اچانک ہارون اٹھا اور اس نے اپنے بڑے بیٹے کو دریا میں پھینک دیا۔ سب کی چیخ نکلی اور پھر سب خاموش ہو گئے۔ لیکن پانی اب بھی کشتی میں آ رہا تھا، ملّاح مستقل روکنے کی جد و جہد کر رہا تھا۔ مجبوراً اسے پھر کہنا پڑا۔۔ خدا کے واسطے اپنی زندگی کے لیے ایک اور قربانی دو۔ ہارون کو تامّل ہوا لیکن پھر اس نے اپنے دوسرے بیٹے کو دریا کے سپرد کر دیا۔ پھر تیسرا اور چوتھا کشتی کو بچانے کے لیے قربان ہوا۔ ملّاح بے بس تھا، وہ ہارون سے شرمندہ تھا۔ ہارون کی بیوی اپنے سامنے اپنے چاروں بیٹوں کی قربانی دیکھ کر بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کے دونوں چھوٹے بھائی سہمے بیٹھے تھے اور منتظر تھے کہ ملّاح اعلان کرے اور پھر وہ بھی دریا کی نذر ہو جائیں۔ لیکن کشتی کا بوجھ کافی کم ہو چکا تھا اور کنارہ بھی قریب تھا اور پھر وہ کنارے تک پہنچ گئے۔ ہارون نے کنارے پہنچ کر سب سے پہلے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کی بیوی اب بھی بے ہوش تھی۔ ملّاح ہارون کی ہمّت اور حوصلے پر انگشت بدنداں تھے۔ جب ذرا سکون ہوا تو ایک ملّاح نے ہارون سے دریافت کیا۔

''اے برادر کیا تم بیان کرو گے تم نے اپنے بھائیوں کو بیٹوں پر کیوں ترجیح دی۔ کیا وہ تمہاری حقیقی اولاد نہیں تھے۔''

ہارون نے دُکھ بھرے لہجہ میں کہا۔

''میرے عزیز کچھ بچانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ بے شک وہ میری حقیقی اولاد تھے اور مجھے ان کے ڈوبنے کا دکھ ہے''۔

لیکن تم نے ایسا کیوں کیا؟ کیا تم اپنے بھائیوں کو دریا کے حوالے نہیں کر سکتے تھے؟''

ملّاح نے پھر سوال کیا۔

''نہیں! میں ایسا نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ وہ بھائی میرے پاس کسی کی امانت ہیں اور اولاد میری اپنی تھی۔''

''لیکن اولاد آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں اور اس سے خاندان کا نام باقی رہ سکتا ہے۔

ملّاح نے پھر کہا۔ ہارون کہنے لگے۔

یہ بھائی بھی میری آنکھوں کے ٹھنڈک ہیں اور ان سے بھی خاندان کا نام باقی رہ سکتا ہے۔ یہ بھائی مجھے اپنی اولاد سے زیادہ عزیز ہیں۔''

''اس کا سبب؟'' ملّاح حیران تھا۔

''اس لیے کہ میں ابھی تندرست و توانا ہوں اور میری بیوی حیات ہے۔ خدا کو منظور ہوا تو وہ مجھے چار سے زیادہ بیٹے ابھی دے سکتا ہے۔ لیکن ان بھائیوں کو اگر میں نے کھو دیا تو پھر حاصل نہیں کر سکتا اس لیے کہ میرے والدین وفات پا چکے ہیں اور یہ دو بھی میرے پاس ان کی آخری نشانیاں ہیں اگر اب بھی دریا کوئی قربانی مانگتا تو میں بیوی سے درخواست کرتا کہ وہ خود اس کے لیے آمادہ کرے کہ شریک حیات کا بھی دوبارہ حاصل کرنا ممکن ہے۔''

ہارون اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا ملّاح کی زبان سے پھر کوئی سوال نہیں نکلا اور پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ وہ چاروں بیٹے بھی بہتے ہوئے ساحل سے آ لگے۔ ان کی سانسیں ابھی باقی تھیں۔ لیکن بے ہوش تھے۔ ملاحوں نے ان کے پیٹ سے پانی نکالا۔ تھوڑی دیر بعد انہیں ہوش آ گیا۔ ہارون خوش ہوا اور خدا کا شکر ادا کر کے آگے کے لیے اپنا سفر شروع کیا۔''

یوسف یہ قصّہ سنا کر خاموش ہو گیا۔ جہاز مسلسل سمندر کا پانی چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ بہت سے مسافر سونے لگے تھے اور بعض سمندر کی لہروں سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی چاندنی کا نظارہ کر رہے تھے۔ اچانک جہاز کے اندر ایک بے چینی کی لہر دوڑی۔ خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ لال روشنیاں روشن ہو گئیں۔ سوتے ہوئے مسافر اُٹھ گئے، جہاز میں کہیں سے پانی آنے لگا تھا۔ جہاز کا عملہ حیران و پریشان اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا۔ تمام مسافر موت کو قریب دیکھ کر گھبرا رہے تھے۔ پھر اچانک لاؤڈ اسپیکر پر جہاز کے کپتان نے اعلان کیا۔

''ساتھیو! ہمارے جہاز میں پانی بڑھتا جا رہا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے ہمارے پاس صرف ایک راستہ باقی ہے کہ ہم اپنے ساتھیوں میں سے ایک ایک فرد کی قربانی دیں۔ میں آپ سے دُکھ بھری درخواست کرتا ہوں کہ آپ اپنے کسی ایک ساتھی کو سمندر کے حوالے کر دیں۔''

سبھی مسافر یہ اعلان سن کر پریشان ہوئے۔ یوسف کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس کی بیوی نے اپنے تینوں بیٹوں کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ یوسف پریشان تھا کہ وہ کس کو قربان کرے۔ جہاز کے کپتان نے پھر اعلان کیا کہ ''براہ کرم اس میں تاخیر نہ کریں۔''

یوسف نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا، وہ اپنے بیٹوں کو چمٹائے ہوئے قہر آلود نگاہوں سے یوسف کو دیکھ رہی تھی۔ بہت دیر تک وہ ایک کشمکش میں مبتلا رہا اور پھر اسی کشمکش اور بے بسی کے عالم میں اس نے اپنے بھائی سے درخواست کی۔

''اے عزیز از جان! تو مجھے بے حد عزیز ہے لیکن میں بے بس اور لاچار ہوں خدا کے لیے میری خاطر تُو اس قربانی کے لیے

خود تیار کر لے۔''
***

صرف ایک دن کے لیے

سب خوش تھے۔ بہت خوش۔ ہر چہرہ مسرت کا اظہار کر رہا تھا۔ پیر وجواں، خرد و کلاں، زن و مرد اپنی مسکراہٹوں سے راستوں میں کلیاں بچھا رہے تھے کہ جس وقت سے منادی نے اعلان کیا تھا کہ ہر خاص و عام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ ٹھیک آٹھ روز بعد یعنی بروز دو شنبہ بادشاہ سلامت اس گاؤں میں تشریف لائیں گے اور غریبوں کی فریادیں سنیں گے۔ گاؤں کے تمام لوگوں سے درخواست ہے کہ وہ یہاں کی صفائی میں مدد کریں۔ اور پھر یوں ہوا کہ ہر شخص اپنے گھر، اپنی دوکان اور اپنی گلی کوچے کی صفائی اس طرح کرنے لگا جیسے اس کے گھر کوئی مہمان آنے والا ہو۔ دیواروں کے اندر، کھلے میدانوں میں، راستوں میں، کھیتوں کھلیانوں میں یہی ذکر تھا کہ بادشاہ سلامت کے آنے میں کتنے دن اور باقی ہیں؟ وہ کس طرح آئے گا؟ وہ کیسا ہو گا؟ کیا ہم اس سے مل سکیں گے؟ باورچی خانہ میں روٹی پکاتے ہوئے ''الف'' کی بیوی نے کہا:
''سنتے ہو۔ میں سوچ رہی ہوں کہ بادشاہ سلامت کے آنے والے دن اپنی گائے کے دودھ کی کھیر بنا کر رکھ لوں۔ اگر وہ ہمارے جھونپڑے میں آئے تو کھلا دوں گی۔ بازار سے تھوڑا سا ناریل لیتے آنا۔''
''ٹھیک ہے۔ ذرا اچھی سی بنانا۔ حاکم لوگ ہیں پتہ نہیں کیسا کھاتے ہوں گے۔'' الف نے یہ بات اتنے اعتماد کے ساتھ کہی جیسے بادشاہ صرف اُسی کا مہمان ہو۔ ہر شخص کی دانست میں بادشاہ اس کا مہمان تھا ''جیم'' اپنی بیوی اور جوان بیٹے بیٹیوں سے کہہ رہا تھا۔
''ارے تم لوگوں نے ابھی تک کچھ نہیں کیا۔ بادشاہ سلامت کے آنے میں صرف پانچ دن باقی رہ گئے ہیں میں کہا تھا کہ گھر کے دروازے کے آس پاس سفیدی کر لو۔ ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کو ہٹا دو۔ ارے بادشاہ سلامت دیکھیں گے تو کیا کہیں گے'' اور اس کی بات ختم ہوتے ہی سب صفائی کے کام میں لگ گئے۔
ہر گھر سے یہی آوازیں آ رہی تھیں۔
''سنیے میں تو اس روز اپنے گھر کے دروازے پر بہت سے چراغ جلا کر روشنی کروں گی۔''
''ارے وہ تو دن میں آئیں گے۔''
''تو کیا ہوا رات کو بھی تو ٹھہریں گے۔ گاؤں کی رات بھی دیکھیں گے۔ میں تو کہتی ہوں کہ پوری بستی میں چراغ جلنے چاہئیں تاکہ اندھیرا پتہ ہی نہ چلے۔''
ہاں اپنی زندگیوں میں تو اندھیرا ہے لیکن اپنے حاکم کے راستوں کو روشن کرنے کے لیے اپنے لہو کے چراغ جلانے چاہئیں۔''
''تم تو ہمیشہ بے سر پیر کی باتیں کرو گے۔''
کوئی شخص اپنے حاکم کے خلاف کوئی لفظ سننے کو تیار نہیں تھا ان کا کہنا تھا۔
''حاکم تو حاکم ہوتا ہے۔ اُسے خدا خود ہی بناتا ہے''
''ہاں بھئی بادشاہ تو زمین پر خدا کا نائب ہے۔''
''ارے میاں بزرگوں نے کہا ہے کہ بادشاہ کی تنہا جان ہزاروں غریب جانوں کے برابر ہوتی ہے۔''
''بالکل ٹھیک کہتے ہو بھائی۔ بادشاہ نہ ہو تو لوگ بھوکے مر جائیں۔''
جھوٹ۔ بالکل جھوٹ۔ بادشاہ کچھ نہیں کرتا۔ لوگ روزانہ بھوک سے مرتے ہیں۔''
ایک نوجوان نے تیز آواز میں کہا سب نے اسے غصّے سے دیکھا لیکن وہ کہتا رہا۔
''لوگ گاؤں کی گندگی سے مرتے ہیں۔ کیڑے مکوڑوں کی طرح زندگی گذرتے ہیں۔ آج یہاں کی صفائی ہو رہی ہے۔ اس لیے کہ بادشاہ آ رہا ہے۔ اتنے برسوں سے گاؤں سڑ رہ ہے تو کوئی دیکھنے نہیں آیا۔ بادشاہ آئے گا۔ بھُوکوں کو کھانا بانٹے گا۔ ننگوں کو کپڑے دے گا۔ مظلوموں کی فریادیں سنے گا۔ سب کچھ ملے گا لیکن صرف ایک دن۔ پھر سب بھوکے رہیں گے۔ سب ننگے رہیں گے۔ سب ظلم سہیں گے۔ کوئی کچھ دینے یا سننے والا نہیں ہو گا۔'' نوجوان بہت غصے میں تھا کسی ایک شخص کی آواز آئی۔
''یہ دیوانہ ہے۔ پاگل ہے۔''

پھر سب نے کہا

''ہاں یہ پاگل ہے ـــحاکم اعلیٰ کو بُرا کہتا ہے۔ اسے گاؤں سے نکال دو۔ حاکم کے خلاف آواز نکالنے والا باغی ہوتا ہے۔ اس کی باتوں سے بغاوت کی بُو آ رہی ہے۔ اس کی زبان بند کرو۔''

سب نے مل کر اسے خاموش کر دیا کہ یہ وقت ہجو کا نہیں صرف قصیدہ خوانی کا ہے۔

اب بادشاہ کے آنے میں صرف دو دن باقی رہ گئے تھے گاؤں کے افراد کے دلوں کی دھڑکنیں اس طرح تیز ہونے لگی تھیں جیسے معزز مہمان آنکھوں کی زد میں آ گیا ہو اور اس کے استقبال کا انتظام ابھی تک نامکمل ہو۔ ہر فرد خوشی کے ساتھ ساتھ گھبراہٹ بھی محسوس کر ہا تھا اس کے دل میں یہ خوف تھا کہ ''اگر بادشاہ نے مجھ سے کوئی سوال کر لیا تو کیا جواب دوں گا۔ اور کس طرح؟''

کوئی اور کہہ رہا تھا۔

''میاں حاکموں سے بات کرنے کے لیے سلیقہ چاہیے۔ ہر ایک کے بس کی بات نہیں بڑے آدمی سے بات کرنے کے لیے بڑا آدمی ہونا بھی ضروری ہے۔''

ایک اور کی رائے تھی کہ:

''بھائی بادشاہ ہم لوگوں سے کہاں بات کرے گا۔ ہم ٹھہرے غریب لوگ، گندے لوگ، وہ تو خوشبوؤں میں بسا ہو گا۔ ویسے بھی بڑے لوگوں کو غریب آدمیوں میں سے بدبو آتی ہے۔''

دوسرا آدمی بول پڑا۔

''ہم نے تو بھیّا نئے کپڑے سلوائے ہیں۔ ایسا موقع زندگی میں پہلی بار آیا ہے۔ ہمارا گاؤں بڑا قسمت والا ہے کہ بادشاہ سلامت یہاں آ رہے ہیں۔''

اب بادشاہ کے آنے میں صرف ایک رات باقی تھی پورے گاؤں کو ان سرکاری ملازموں نے چمکا دیا تھا جو اسی کام کے لیے برسوں سے یہاں مقرر تھے اور جو پہلے یہاں کبھی نہیں آئے تھے۔ تمام کچّے اور ٹوٹے ہوئے راستوں کو صاف کر دیا تھا۔ گلی کوچوں سے کوڑا کرکٹ ہٹا دیا تھا نالیوں کی گندگی بہا دی گئی تھی۔ گاؤں کی شکل بدل گئی تھی لگتا تھا جیسے یہاں ہر روز اسی طرح صفائی ہوتی ہے۔ ہر شخص اسی طرح خوش و خرم رہتا ہے۔ اسے کوئی تکلیف نہیں۔ گاؤں میں تعینات سرکاری ملازموں نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ وہ بادشاہ سلامت سے کوئی تکلیف بیان نہ کریں کیوں کہ تمہاری تکلیف سے انہیں دکھ ہو گا۔ بلکہ کہنا کہ ہم سب بہت خوش ہیں۔ گاؤں میں روزانہ اسی طرح صفائی رہتی ہے۔ سب نے ان باتوں سے اتفاق کیا تھا کہ وہ بغاوت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔

اور جب دو شنبہ کی صبح کو آفتاب نکلا تو اس کی آب و تاب کچھ اور ہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے آج کا آفتاب صرف اسی گاؤں کے لئے نکلا ہے۔ راستے چمک رہے تھے، دیواریں جگمگا رہی تھیں۔ چہروں پر تازگی تھی۔ اس روز گاؤں کے تمام پھولوں کو توڑ کر ہار بنا لیے گئے تھے گاؤں کے تمام افراد اپنے ہاتھوں میں ہار لیے گھروں سے باہر نکل آئے تھے اور گاؤں سے باہر راستے کے اطراف کھڑے ہو گئے تھے۔ تمام نگاہوں کو انتظار تھا۔ بادشاہ کے آنے کا وقت قریب آ گیا تھا اور پھر اچانک ہٹو بچو اور نعروں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ نقیب بادشاہ کی آمد کا اعلان کر رہا تھا۔ گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں سنائی دینے لگے۔ دھیرے دھیرے سواری کا جلوس اور نزدیک آ گیا۔ بادشاہ ہاتھی پر سوار تھا۔ اس کے چاروں طرف تلواریں لیے ہوئے مسلح سپاہی چل رہے تھے۔ گاؤں والوں نے خوشی سے بادشاہ کے اقبال کی بلندی کے نعرے لگائے۔ اس کے اوپر پھول برسائے۔ بادشاہ نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا کر ان کے استقبالیہ نذرانوں کو قبول کیا۔ اور ان کی خوشحالی دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ آہستہ آہستہ سواری آگے بڑھتی گئی۔ بادشاہ کو دیکھنے کے لیے بچّے، مرد، عورتیں دیواروں، چھتوں اور پیڑوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ عورتیں چھتوں سے پھول برسارہی تھیں اور بادشاہ کی شان میں قصیدے پڑھ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد بادشاہ کی سواری گاؤں سے گذر گئی۔ اور جلوس کا غبار گاؤں میں باقی رہ گیا۔ بادشاہ گاؤں میں ٹھہرا نہیں۔ اس نے گائے کے دودھ کی کھیر نہیں کھائی۔ اس نے گھروں کے دروازوں پر جلے ہوئے چراغوں کی روشنی کو نہیں دیکھا۔ اس نے کسی کی فریاد نہیں سنی۔ شاید چہروں پر تمام زندگی کی خوشیاں سمیٹے ہوئے لوگوں میں کوئی فریادی نہیں تھا۔ کئی روز بیت گئے۔ راستے پھر خراب ہو گئے۔ گلی کوچوں میں پھر کوڑا کرکٹ جمع ہو گیا۔ نالیوں سے پھر بدبو آنے لگی۔ گھر پھر بے چراغ ہو گئے۔ ایک شخص کہنے لگا۔

''بادشاہ یہاں ہر روز کیوں نہیں آتا؟''

دوسرے نے سوال کیا۔

''بادشاہ یہاں ہر روز کیوں آئے؟ اس نے تو ایک ہی دن میں رعایا کی خوشحالی دیکھ لی۔''

***

شام ہونے سے پہلے

طیّارہ خلاؤں کا سینہ چیرتا ہوا ان فصاؤں کی سمت بڑھ رہا تھا جن میں میری عمر کا عزیز ترین حصّہ گذرا تھا۔ طیارہ کی ایک نشست پر میں اپنے اُس مُردہ جسم کو لیے بیٹھا تھا، جو آج اپنے اندر زندگی کی دھیمی دھیمی رمق محسوس کر رہا تھا۔ میرا باپ کہ جس نے اپنے جسم کے ایک قطرۂ غلیظ سے مجھے اس لیے پیدا کیا تھا کہ سن بلوغ میں داخل ہونے کے بعد میں اس کے لیے بے پناہ دولت اِکٹّھی کروں گا، مجھ سے کہہ رہا تھا۔

''تو کاہل ہے۔''

جب کہ ہر روز میں اُس کے بے مقصد جسم کو عالمِ آب و گل میں قائم رکھنے کے لیے تین وقت غذا فراہم کرتا تھا کہ مجھے اپنے فرض کا احساس تھا اور اپنی دانست میں فرمانبردار بھی تھا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ عہدِ طفلی میں اِس نے مجھے اپنے قدموں پر چلنا سکھایا تھا۔

''تو محنت سے جی چُراتا ہے، تو مشقت سے بچتا ہے، تو نہیں جانتا کہ میں نے دن رات کی محنت و مشقت کے بعد تیرے گودڑوں میں لپٹے ہوئے گوشت کے لوتھڑے کو اتنا بڑا جسم دیا ہے۔''

یقیناً اس نے ایسا کیا تھا اور اب شاید وہ ان فرائض کو احسانات عظمیٰ کی شکل میں پیش کر کے مجھ سے بدل چاہتا تھا، نہیں اس کا مقصد یہ نہیں تھا۔ غالباً وہ چاہتا تھا کہ زندگی کی اُس منزل پر پہنچ کر کہ جس سے وہ گزر رہا ہے، مجھے کسی کا محتاج نہ رہنا پڑے۔ اسی لیے وہ کہتا تھا:

''دنیا کا سب سے مشکل کام زندہ رہنا ہے۔ سکون کا ایک لمحہ حاصل کرنے کیے برسوں پسینہ بہانا پڑتا ہے۔ سونا تپنے کے بعد کُندن بنتا ہے اور تو اگر اسی طرح جیتا رہا تو ایک دن زنگ آلود بن کر رہ جائے گا۔''

وہ اس انداز سے کہتا جیسے اُسے اس بات کا احساس ہی نہ ہو کہ نہ جانے کتنے آفتابوں کی تپش ہر روز میرے سر سے گزر جاتی ہے۔ تب بے جان سکّے حاصل کر پاتا ہوں، جو جاندار انسان سے .زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

''تیرے پاس ابھی زندگی بنانے کا وقت ہے۔ تیرے اعضائے بدن جو ان اور مضبوط ہیں جو زر کثیر حاصل کرنے کے لیے اپنے گھروں کو چھوڑ کر اُس دمکتے ہوئے ریگستان میں رہ رہے ہیں، وہ دمکتے ہوئے ریت کے ذرّات نہیں بلکہ زرِ سُرخ ہے جو لوگوں کو اپنی سمت کھینچ رہا ہے۔''

یہ مجھے بھی معلوم تھا، میں نے بھی بہت سے گھروں میں اُس صحرا سے دولت آتے ہوئے دیکھی تھی۔ لیکن میں شاید قناعت پسند تھا یا مجھے اپنا گھر زیادہ عزیز تھا یا اس میں رہنے والے افراد مجھے زیادہ پیار تھے جن میں میری شریکِ حیات اور عزیز ترین بچے بھی شامل تھے۔

''شاید تجھے اپنے بچّوں سے پیار نہیں، تجھے ان کے مستقبل کی فکر نہیں تو چاہتا ہے کہ یہ بھی تیری طرح علم کی دولت سے محروم رہیں اور دن رات کی محنت و مشقت کے بعد آدھا پیٹ کھانا کھائیں اور جب تیرے اعضائے بدن مفلوج ہو جائیں تو کاسۂ گدائی تیرے ہاتھوں میں آئے۔''

اور اب میں آہستہ آہستہ اس سفر سخت کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوتا جا رہا تھا۔ میری ماں جو کہ مجھے بیحد عزیز رکھتی تھی، مجھے اس سفر سے روکنا نہیں چاہتی تھی۔

''بیٹے تیری اس قربانی کو یہ تیرے چھوٹے بھائی ہمیشہ یادرکھیں گے۔''

مجھے حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کی یاد آئی، نہیں میرے بھائی ایسے نہیں تھے، لیکن میں بار بار سوچتا کہ میری بیوی کہ جس کا سر پرست صرف میں ہوں، جس کی تمام ذمّہ داریاں صرف مجھ پر ہیں، کیا اتنی طویل مُدّت تک میرے بغیر رہ سکے گی۔

جوہر صبح مجھ سے کہتی ہے کہ شام ہونے سے پہلے لوٹ آنا۔ کیا میرے جانے کے بعد اس کی ہر شام صبح میں تبدیل نہ جائے گی، اور میرے معصوم بچّے جو گھر کی چوکھٹ پر بیٹھ کر میرا انتظار کرتے ہیں، ان کی آنکھیں میرے انتظار میں پتھرا نہ جائیں گی۔

انجام کار میں آمادۂ سفر ہوا کہ ابھی میرے اعضائے بدن جوان اور مضبوط تھے اور زندگی کا ایک وسیع میدان مجھے پار کرنا تھا۔

گھر چھوڑنے سے قبل میں اپنی ضعیف العمر دادی کے پاس دعائیہ کلمات سننے کے لیے گیا۔ اس نے اپنے کپکپاتے ہاتھوں کو

میرے سر پر رکھ کر کہا۔
''جاؤ بیٹے، خدا تمہارا سفر کامیاب کرے، لیکن واپسی میں اتنی دیر نہ لگانا کہ تمہیں یاقوت کی طرح پچھتانا پڑے۔''
میں نے استفسار کیا ''یاقوت کو کیوں پچھتانا پڑا؟''
اُس نے کہا:
''بہت پہلے کی بات ہے کہ ملک یمن میں یاقوت نامی ایک سوداگر اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ وہ تجارت کے لیے کبھی اپنے ملک سے باہر نہیں گیا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کے پاس کبھی زر کثیر اکٹھّا نہیں ہوا لیکن وہ خوش تھا کہ اُس کی طبیعت میں ہوس نہیں تھی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اس کے ایک دوست نے از راہِ ہمدردی اُسے مشورہ دیا کہ چند روز میں ایک قافلہ ملکِ چین کی طرف جانے والا ہے تُو اپنا سامان لے کر ان کے ہم راہ چلا جا کہ وہاں تجھے بہت نفع ہو گا، بے شمار مال و زر تیرے ہاتھ آئے گا۔ زندگی آرام سے گزرے گی۔ بہت غور و خوض کے بعد یاقوت اپنی بیوی اور دو بچّوں کو چھوڑ کر ملک چین روانہ ہوا، دولت کی چاہت میں کئی برسوں تک گھر نہیں لوٹا اور جب اس کے پاس بہت سارا زر اکٹھّا ہو گیا تو واپس گھر آیا۔ لیکن گھر کا عجیب حال پایا۔ جب وہ گھر سے رخصت ہوا تھا تو اس کے گھر میں صرف دو بچّے تھے اور اب اس کی بیوی کے پاس چار بچے موجود تھے۔ اسے اپنی بیوی کی بد کاری پر سخت غصّہ آیا اور اسی عالمِ غضب میں اس نے تلوار نکال کر اپنی بیوی کو قتل کر ڈالا۔ لیکن بعد میں اسے پچھتاوا ہوا۔ ' میں نے بے قصور اپنی بیوی کو مار ڈالا۔ قصور تو میرا ہی تھا کہ میں نے واپسی میں اتنا عرصہ لگایا۔''
یاقوت سوداگر کا قصّہ سن کر میں باہر آیا۔ جہاں میری بیوی میری راہ تک رہی تھی۔ میری آنکھیں اس کے چہرے پر گڑ گئیں اور وفاداری کے عہد کی پختگی کو دیکھنے کے لیے اس کے جسم میں اتر گئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ان ناریوں میں سے ہے جو اپنی پوترتا کو سُرکچھت رکھنے کے لیے پتی کے ساتھ ستی ہو جایا کرتی تھیں۔ مجھے گزشتہ شب، جو اس کے ساتھ گزاری تھی۔ یاد آئی ...وہ امر بیل کی طرح مجھ سے لپٹ جانا چاہتی تھی تاکہ کبھی جُدا نہ ہو سکے۔ جیسے اس رات کے بعد وہ اس لمحاتی لذت سے محروم ہو جائے گی اور جب اس کے ہونٹ زخمی ہونے لگے تھے۔ بدن مخموریت کی گراں باری سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر نے لگا تھا، تو اس نے اپنی پُر نم آنکھوں اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے منّت کی تھی۔
''شام ہونے سے پہلے لوٹ آنا کہ میرا حال بھی کہیں ملکہ بلقیس کا سا نہ ہو۔''
میں نے دریافت کیا۔
''ملکہ بلقیس پر کیا گزری تھی۔''
اس نے اپنی بے ترتیب سانسوں کو سمیٹ کر ملکہ بلقیس کی کہانی سنائی۔
''ملک شوقستان میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا جو بہت شان و شوکت والا تھا۔ اسی بادشاہ کی حسین و جمیل ایک ملکہ تھی کہ جس کا نام بلقیس تھا۔ وہ بادشاہ کو عزیز از جان رکھتی تھی اور بادشاہ بھی اسے بے انتہا چاہتا تھا۔ ایک مرتبہ شبِ خلوت میں بادشاہ نے بلقیس سے کہا۔
''اے دل آرام بادشاہوں کا کام اپنے ملک میں بیٹھے رہنے کا نہیں ہوتا، تاریخ شاہد ہے کہ بڑے بادشاہ وہی کہلائے جنہوں نے دوسرے ممالک کی تسخیر کے لیے اپنے ملک سے کُوچ کیا۔ ہم بھی یہ ارادہ رکھتے ہیں اور عنقریب سفر کے لیے روانہ ہونا چاہتے ہیں۔ ہماری خواہش تھی کہ آپ کو بھی ہمراہ لے چلتے لیکن ہم نہیں چاہتے کہ آپ ناحق راہ کے مصائب کو برداشت کریں کہ ہم بہت جلد مراجعت کریں گے۔''
اس نیک بخت نے ایک حرفِ تکرار بھی زبان سے نہ نکالا بعد چند روز کے بادشاہ نے ایک لشکرِ جرّار کے ساتھ کُوچ کیا۔ برسوں بیت گئے۔ بادشاہ واپس نہیں لوٹا۔ بلقیس کی آنکھیں بادشاہ کے انتظار میں پتھرا گئیں اور جب بادشاہ بہت سے ممالک کی فتوحات کے بعد اپنے وطن واپس آیا تو بہار ختم ہو چکی تھی، ویرانیاں گھر کر چکی تھیں، پورے شہر میں بادشاہ کی واپسی پر چراغاں کیا گیا، لیکن ملکہ بلقیس کلبۂ احزن ہی میں بیٹھی رہی۔ اس کی خوشیاں مُردہ ہو گئی تھیں، اُس کا شباب اتر چکا تھا۔''
بلکہ بلقیس کی داستان اپنی بیوی کی زبانی سن کر میرے سفر کے ارادے میں لرزش پیدا ہوئی تھی لیکن اسی لمحہ مجھے اپنے بچوں کے مستقبل کا خیال آیا اور میں نے اُسے دلاسا دیا۔
''ہاں شام ہونے تک لوٹ آؤں گا۔''
پھر وقتِ رخصت مجھے اس طرح عورتوں نے رو رو کر وداع کیا جیسے میں سفر آخرت کے لیے روانہ ہو رہا ہوں، چالیس قدم ساتھ چلنے کی رسم ادا کرنے کے لیے میرے عزیز و اقارب اس منزل تک آئے کہ جہاں سے طیّارے کو پرواز کرنا تھا۔
اور جب میں طیارے میں سوار ہونے لیے جانے لگا تو میرے باپ نے کہ جس کے اصرار پر اس سفر دور دراز کے لیے تیار ہوا تھا، مجھ سے کہا۔
''جس قدر تم محنت کرو گے، اس کا پھل پاؤ گے اور اگر درمیان میں لوٹ آئے تو ابو جبّار کی طرح کفِ افسوس ملو گے۔''

میں نے معلوم کیا۔
''ابو جبار کو کیوں کفِ افسوس ملنے پڑے۔''
اس نے ابو جبار کی کہانی میرے سامنے بیان کی۔
''شہر اصفہان میں جعفر نام کا ایک تاجر تھا۔ نہایت عاقل اور دانا۔ اس کے ابو جبّار نام کا ایک جوان بیٹا تھا۔ ایک مرتبہ ایک تاجروں کا قافلہ شہر افریشیاں کی سمت جا رہا تھا۔ جعفر تجار نے ابو جبار کو کچھ سامان دے کر قافلے کے ہمراہ کیا۔ ابو جبار کے پاس عرصہ قلیل میں ہی اچھا خاصہ زر اکٹھا ہو گیا۔ ابو جبار نے جب اپنے پاس اتنا زر دیکھا تو دل میں سوچا کہ کیوں نہ میں اپنے وطن لوٹ جاؤں اور اس روپے سے عیش کروں۔ اس خیال کے آتے ہی وہ قافلے کے منزل تک پہنچنے سے قبل ہی وطن لوٹ آیا۔ جعفر نے اس کی کم عقلی اور حوصلہ شکنی پر ملامت کی کہ یہ زر جو تو نے کمایا ہے، عرصۂ قلیل ہی میں ختم ہو جائے گا اگر تو آخر وقت تک قافلے کے ساتھ رہتا تو اتنا مال و زر پاتا کہ تمام عمر تجھ سے خرچ نہ ہوتا۔ ابو جبار نے سوچا کہ جب یہ زر ختم ہو جائے گا تو پھر کسی قافلہ کے ساتھ چلا جاؤں گا، لیکن پھر کوئی قافلہ اُدھر سے نہیں گزرا اور وہ زندگی بھر کفِ افسوس ملتا رہا۔''
شاید میرا باپ صحیح کہہ رہا تھا۔ میں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا کہ جسے میں اس لیے اپنے گھر لایا تھا کہ عمر بھر ساتھ رکھوں گا۔ اُس کی آنکھوں میں تشنگی کی جھلک نمایاں ہونے لگی تھی۔ لیکن مجھے جانا تھا اور میں چلا گیا۔ برسوں بیت گئے۔ گھر کے افراد کے لیے میں مال و زر بھیجتا رہا۔ سب خوش تھے کہ اتنے خوش وہ پہلے کبھی نہیں تھے۔ وہ یعنی میری بیوی بھی خوش تھی میں نہیں جان سکا کہ وہ لکھنا نہیں جانتی تھی کہ بدستِ خود اپنا حال لکھتی۔ میرے بچّے بڑی درس گاہوں میں علم حاصل کر رہے تھے۔ میرے بھائی جو ان ہو گئے تھے۔ سب کچھ پہلے سے بہتر تھا اور میں وقتِ مقر رہ سے پہلے واپس جانا نہیں چاہتا تھا کہ میرے باپ نے نصیحت کی تھی۔ اور پھر صحرا کے زر سرخ کی چمک نے میری آنکھیں چوندھیا دی تھیں کہ میں گھر کا راستہ بھُول گیا تھا۔
طیارہ جب میرے ملک کی سر زمین پر اُترا تو تمام لوگ جو میرے استقبال کے لیے آئے تھے، میری طرف بڑھے، سب کے چہروں سے خوشی اور تازگی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ میرا باپ کہ جس کے کہنے سے میں نے یہ سفر اختیار کیا تھا، پہلے سے تندرست ہو گیا ہے۔ میرے بھائی صاحبِ عزّت آدمی بن گئے ہیں۔ میرے بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ مجھے یاقوت سوداگر کی کہانی یاد آئی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ وہ تین ہی تھے جو میں چھوڑ کر گیا تھا۔ میری نگاہوں نے بیوی کو تلاش کیا لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ شاید برسوں سے ویران پڑے گھر کو سجا کر میری منتظر ہو گی۔ سب کے ساتھ میں گھر پہنچا، صحرا کا زر گھر کو نئی زندگی و آرام کا سامان وہاں موجود تھا۔ میں نے دیکھا کہ میری بیوی شام ہونے انتظار میں چوکھٹ سے لگی کھڑی ہے۔ مجھے ملکہ بلقیس کی داستان یاد آئی۔ میں نے اپنے اندر اُسے دیکھنے کی جرأت نہیں پائی اور نگاہیں جھُکا لیں کہ آج مجھے شرمندگی کا احساس ہوا۔ وہ بھی کچھ بول نہ سکی۔
اور جب رات کی تنہائی نصیب ہوئی تو میں اُس کے پاس گیا اسی جوش و خروش کے ساتھ کہ جو رخصت ہونے کے آخری شب کو تھا اور وہ امر بیل کی طرح مجھ سے لپٹ جانا چاہتی تھی۔ میں نے اس کے گرد بانہیں پھیلا اُسے کسنا چاہا، لیکن مجھے لگا کہ جیسے میرے بازو میرے جسم سے جُدا ہو چکے ہیں۔ میں نے اس کے ہونٹوں کے لمس کو پانے کے لیے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیے لیکن مجھے محسوس ہوا کہ جیسے مرے اندر لمس پانے کی حس ختم ہو گئی ہے۔ میں چونک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ قدِ آدم آئینہ میرے روبرو تھا اور اس آئینے میں کہ جس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا، میں اپنا عکس دیکھ کر لرز اُٹھا کہ میرے جسم کا ایک ایک عضو الگ ہو چکا تھا۔ شاید میں کئی صدیوں کے بعد لوٹا تھا اور اب ان بکھرے ہوئے اعضاء کو جوڑ نانا ممکن تھا۔ میرے بالوں کی سفیدی صبح کی آمد اور رات کے ختم ہونے کی شہادت دے رہی تھی۔ میں نے بیوی کی طرف دیکھا کہ جس کی وفاداری کو دیکھنے کے لیے میں نے اپنی آنکھیں اُس کے اندر اُتاری تھیں، وہ پتھرائی ہوئی آنکھیں لیے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں صرف اتنا کہہ سکا۔
''معاف کرنا شام ہونے سے پہلے گھر نہ لوٹ سکا۔''
***

وہ بالکل تنہا تھا۔
لیکن کچھ دن پہلے وہ تنہا نہیں تھا۔
اور اب وہ تنہائی کے ڈراونے جنگل سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہر اس جاندار سے پوچھتا جو اس جیسا تھا۔ ''کیا شہر میں اب بھی انسانوں کا قتل ہو رہا ہے؟ کیا اب بھی شہر جل رہا ہے؟''
''ہاں''
ایک لمبے عرصہ تک وہ اپنے سوالوں کا یہ جواب پا کر ٹوٹنے سا لگا تھا کہ پھر ایک اور راہ گیر اُدھر سے گزرا تو وہ اس کی طرف لپکا لیکن اسی لمحے ٹھہر گیا اور تیز تیز آنکھوں سے دیکھنے لگا کہ راہ گیر کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار تو نہیں اور جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ خالی ہاتھ ہے تو آگے بڑھ کر اس نے پھر وہی سوال کیے
''نہیں۔''
یہ جواب سُن کر وہ سکتے میں آ گیا اور اتنی دیر تک گم سم کھڑا رہا کہ راہ گیر کافی دور جا چکا تھا شاید اُسے اِس جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ ایک بار پھر اس شخص کی طرف دوڑا اور استفسار کیا۔
''کیا ان مکانوں کے مکین جن کی دیواریں اپنی جگہ پر موجود ہیں جن کی چھتیں ٹوٹی نہیں ہیں، شہر کی سڑکوں پر آزادی سے گھومنے لگے؟''
''ہاں''
اس جواب سے وہ اتنا خوش ہوا کہ جتنا خوش ہونے کی طاقت اس میں باقی رہ گئی تھی۔ اور پھر وہ واپس اس درخت کے نیچے لوٹ آیا جس کو کئی روز سے اس نے اپنی رہائش گاہ بنا رکھا تھا۔ درخت کے نیچے رو مال میں بندھی چند چیزوں کو کھول کر دیکھنے لگا۔ ربر کی گڑیا۔
''ابّو! ابّو! ہم بھی عید گاہ چلیں گے۔''
''نہیں بیٹا آپ تھک جائیں گی۔ بتائیے ہم آپ کے لیے میلے سے کیا لائیں۔''
''وہ——وہ——ربر کی گڑیا۔ اچھی سی جو جھک کر سلام بھی کرتی ہے۔''
''بس——اور کچھ۔''
''اور ——کچھ نہیں ——بس آپ جلدی آئیے گا۔''
''ہاں ہم جلدی آئیں گے۔''
اس نے گڑیا کو اٹھایا تو وہ جھک کر سلام کرنے لگا۔ اس کا دل شہر جانے کے لیے بے چین ہوا تھا۔ جلدی جلدی رو مال باندھا اور مضبوطی سے تھام لیا۔
شہر کی جانب بڑھنے کے لیے اس نے پہلا قدم اٹھایا ہی تھا کہ اسے تنہائی کا احساس ہوا لیکن جب وہ گھر سے چلا تھا تب تنہا نہیں تھا۔ اس کے دو بیٹے اس کے ساتھ تھے۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ دیکھا جس کی انگلی کو پکڑے ہوئے اس کا چھوٹا بیٹا اس کے ہمراہ چل رہا تھا۔ لیکن اب وہ ہاتھ ہی اس کے جسم پر نہیں تھا۔ شاید وہ جلتے ہوئے شہر میں کہیں رہ گیا تھا۔ لیکن اس کا بیٹا؟
''ابّو—— ابّو یہ رو مال میرے سر پر باندھ دیجیے۔''
''لاؤ—— یہیں کھڑے رہنا اور اللہ اللہ کرتے وقت کسی طرف نہیں دیکھنا۔''
''نہیں دیکھوں گا۔ لیکن آپ ہمارے لیے باجا خریدیں گے نا۔''
''ہاں! ہاں! کیوں نہیں۔ پہلے اللہ اللہ کر لو۔''
''پھر گھر چل کر سوئیاں کھائیں گے نا ——بہت ساری''
''ہاں بھئی بہت ساری کھانا لیکن اب تو چپ چاپ بیٹھے رہو۔ دیکھو تمہارے بھائی جان بھی تو نہیں بول رہے۔''
اُس کا بڑا بیٹا ——وہ بھی تو گھر سے اس کے ساتھ چلا تھا۔ اس کا دایاں بازو۔ اس کی دائیں جانب اپنے رب کا۔ سب کے رب کا شکر ادار کرنے کے لیے دست بستہ ایستادہ تھا۔ اور اس نے سجدۂ شکر ادا بھی کیا تھا۔ لیکن اُس نے اور اُن سب بندہائے خدا نے اپنے رب کے آگے ابھی دست دعا بلند نہیں کئے تھے کہ امن پسند فوج کے اس دستہ نے جو ان عبادت کرنے والوں کی حفاظت کے لیے تعینات اور ان کے ہاتھوں میں چنگاریاں اگلنے والے ہتھیار تھے۔ چنگاریاں اگلنے والے ہتھیاروں سے عبادت گاہ کے اندر چنگاریاں برسائیں اور وہ چنگاریاں معصوم بچوں اور مردوں کے جسموں میں اتر کر ان کے نئے ملبوسات کو لہو سے رنگتی چلی گئیں۔ وہ سبھی پناہ گاہوں کی تلاش میں بھاگنے لگے تھے۔ بجز اِس کے وہ کر بھی کیا سکتے تھے کہ وہ سب

کسی فساد کے ادارے سے عبادت گاہ میں نہیں آئے تھے۔ اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اُن کے ساتھ اُن کے معصوم بچے ہیں جو اس منتشر مجمع میں چینٹیوں کی طرح کچلے جا رہے تھے اور ان کی ننھی ننّھی چیخیں فضاؤں کا سینہ چیرتی ہوئی خلا میں گم ہو رہی تھیں کہ ان کا سننے والا کوئی نہیں تھا۔
اس کا بڑا بیٹا ـــوہ بھی بھاگا تھا اور اس افراتفری اور شور و غل کے عالم میں بھی وہ اپنے بیٹے کی چیخ پہچان گیا تھا کہ اس کے جسم میں کئی چنگاریاں اتر گئی تھیں۔
لیکن وہ اس کے گرے ہوئے چند سالوں میں جو ان ہونے والے جسم کو اٹھا نہیں سکا۔ اور اس بھیڑ میں کہ جہاں ہر شخص پناہ گاہ کا متلاشی تھا وہ اپنے بایاں بازوں بھی کھو بیٹھا۔ جواس کے چھوٹے بیٹے کی سواری تھی اور اب سوار اور سواری دونوں گم ہو چکے تھے
سب کچھ چند لمحوں میں ختم ہو گیا۔ کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ جو کچھ باقی بچا تھا وہ اسے دیکھنے کے لیے بستی کی طرف بھاگا۔ اس کی بیوی۔
’’سنیے عید گاہ سے سیدھے گھر آ جائے گا۔‘‘
’’کیوں؟‘‘
’’ملنے والے آنا شروع ہو جائیں گے نا۔‘‘
’’ٹھیک ہے۔ لیکن میٹھے کے ساتھ نمکین وغیرہ بھی سب تیار رکھنا اور ہاں آج تو نئے کپڑے وغیرہ پہن کر تم بھی تیار ہو جاتا۔‘‘
’’ہٹیے بھی۔ مجھے کون سا کہیں جانا ہے۔‘‘
’’نہیں جانا تو کیا ہوا۔ ہم تو دیکھنے کے لیے موجود ہیں۔‘‘
’’اچھا اچھا بس کیجیے۔ اب دیر ہو رہی ہے۔ بچے انتظار میں کھڑے ہیں اور ذرا گڈّو کا خیال رکھیے گا بھیڑ میں کہیں اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔‘‘
ہر شخص اپنے گھر کی طرف دوڑ رہ تھا جیسے اگر اس نے ذرا بھی کوتاہی کی تو پھر کبھی نہ پہنچ سکے گا۔ سڑکوں سے دوڑتا ہوا خوف و ہراس گلیوں اور گھروں میں داخل ہو چکا تھا۔
وہ اپنے گھر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی اور بچوں کی سانسیں خوف کے دھوئیں سے گھٹنے لگی ہیں۔
شیرینی سے بھرے ہوئے پیالے ہاتھوں سے چھوٹ کر فرش پر بکھر چکے ہیں اور اس کے چہرے کی بدحواسی، جسم کے زخم اور تنہا گھر میں آئے ہوئے دیکھ کر اس کی بیوی کی چیخ اٹھی۔
’’میرے بچّے کہاں ہیں؟ کہاں ہیں میرے بچّے؟ وہ تو اپنے رب کے سامنے سجدہ کرنے گئے تھے۔‘‘
سب کچھ ختم ہو گیا۔ سب کچھ۔ اب جو کچھ ہے اُسے بچانے کی فکر کرو۔ ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔ تم اندر سے سب دروازے اور کھڑکیاں بند کر لو۔‘‘
’’خدا کے لیے آپ باہر نہ جائیے۔‘‘
’’میں ابھی آتا ہوں۔‘‘
اور جب تک وہ آیا تھا تب تک سارے شہر میں نظر بندی کا اعلان ہو چکا تھا۔ امن پسند فوج کا وہ دستہ جن کے ہاتھوں میں چنگاریاں اگلتے ہوئے ہتھیار تھے پورے شہر پر منڈلانے لگے اور پھر یوں ہوا کہ ہتھیاروں سے چنگاریاں برسنے لگیں۔ مکانوں سے شعلے بلند ہونے لگے۔ مقید مکینوں کی چیخیں آگ سے شعلوں اور گرتی ہوئی دیواروں میں گھٹ گئیں۔ اس نے دور سے دیکھا۔
اس کے گھر کی چھت زمین کی آغوش میں سما گئی تھی۔ دیواریں اپنی پیشانیوں کو سجدے میں گرا چکی تھیں۔ دروازوں کے پہرے آگے کے شعلوں نے ختم کر دیے تھے اور اسی لمحے اسے تاریخ کے وہ اوراق یاد آ گئے تھے جن میں ہلاکو، چنگیز، نادر شاہ اور انگریزوں کا ذکر تھا۔
وہ گھر سے باہر نکل گیا تھا اور اب دوبارہ نہیں جا سکا۔ گھر ہی ختم ہو گیا تھا۔ کتنے برس اور کتنا خون پسینہ اس کی تعمیر میں صرف ہوا تھا لیکن سب ایک پل میں .....
اس نے چاہا کہ دوڑ کر اپنے گھر کے جلتے ہوئے شعلوں سے لپٹ جائے اور اپنی بیوی بچوں کو گری ہوئی چھت کے نیچے سے نکال لائے۔
لیکن ـــ
اپنی مرضی سے ایک قدم بڑھانے کے حقوق چھین لیے گئے تھے۔ نا اُمیدی اور مایوسی کے عالم میں وہ اپنی جان بچانے کے لیے ایک طرف کو بھاگا اور بھاگتا چلا گیا۔
پھر وہ ہر ایک سے پوچھتا کہ سڑکوں پر نکلنے کی آزادی حاصل ہوئی یا نہیں تاکہ وہ اپنے گھر کی گری ہوئی چھت کے نیچے

سے اپنی بیوی اور بچوں کو نکالے۔ اسے نئے کپڑوں میں دیکھے۔ اپنی بچی کو ربڑ کی گڑیا دے۔ امن پسند فوج اب بھی سڑکوں پر گشت کر رہی تھی۔ اور چنگاریاں اگلنے والے ہتھیار منتظر تھے کہ کب کوئی اپنے جسم سے باہر نکلتا ہوا دکھائی دے اور کب وہ چنگاریاں اگلیں۔

وہ خود کو دوسری آنکھوں سے چُراتا ہوا جب اپنے مکان کے جلے ہوئے ملبے کے پاس پہنچا تو کچھ دیر کے لیے اُس کی آنکھیں ایک جگہ ٹھہر گئیں۔ جسم کی حرکت بند سی ہو گئی۔ بعد چند لمحے گذر جانے کے وہ راکھ اور مٹی کے ڈھیر پر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جیسے اس ملبے میں وہ اپنا مکان ڈھونڈ رہا ہو۔ پھر ایک جگہ بیٹھ کر مٹی اور اینٹوں کو ہٹانے لگا جیسے اپنی اور بچوں کو تلاش کر رہا ہو۔ بہت دیر تک وہ یونہی کُریدتا رہا۔ اچانک وہ دھماکہ کی آواز سے چونک پڑا۔ پرندے اپنی شاخوں سے اُڑ کر آسمان میں پھیل گئے۔ مکانوں کی کھڑکیاں اور دروازے بند ہونے لگے۔ ایک بار پھر کچھ مکانوں سے آگ اُٹھی۔ محافظین جو اسی لمحے کے انتظار میں تھے۔ اپنے ہاتھوں میں لگے ہوئے ہتھیاروں سے چنگاریاں برسانے لگے وہ یہ دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا مضبوطی سے رو مال میں بندھی ہوئی گڑیا کو تھام لیا اور اتنی تیز ایک جانب کو بھاگا۔ اتنی تیز کہ اُسے پتہ نہیں چلا کہ کب کئی چنگاریاں بیک وقت اس کے جسم میں اُتر گئیں اور کب اس کا جسم بہت پیچھے جلتے ہوئے شہر میں رہ گیا۔

***

ایک ہی راستہ

وہ اندر ہی اندر آتش فشاں کی طرح پک رہا تھا اور اُس کے اندر ایک اضطرابی کیفیت موجزن تھی۔ اُس نے اپنے ذہنی اور قلبی سکون کے لیے تمام طریقے اختیار کر لیے تھے لیکن ہر بار ناکام رہا۔ وہ بالکل مایوس ہو چکا تھا اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس عالمِ آب و گل میں چہار جانب اس قدر انتشار پھیلا ہوا ہے کہ صاحبِ چشم نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہر روز اس کے دل میں یہ خدشہ پیدا ہوا تھا کہ آج قیامت کا دن ہو گا اور یہ دنیا نیست و نابود ہو جائے گی کہ اس نے بزرگوں سے قیامت کی نشانیاں سُنی تھیں اور وہ ان تمام علامتوں کو روزانہ دیکھ کر سُن رہا تھا قیامت کے انتظار میں پورا دن گذارنے کے بعد اسے یہ بات بھی مضطرب کرتی تھی کہ موجودہ برائیوں کے علاوہ اب وہ کونسی برائیاں ہوں گی جن کو قیامت کا سبب بتایا جائے گا۔ وہ سوچتا تھا کہ میں کیوں اپنے اطراف کی دنیا کو دیکھ کر پریشان ہوں میں پیغمبر نہیں ہوں کہ اہل دنیا کی نجات کے لیے فکر مند ہوں۔ میں گوتم نہیں ہوں کہ راج پاٹ چھوڑ کر درخت کے نیچے جا بیٹھوں۔ میں عیسیٰ نہیں ہوں کہ دُکھی افراد کے لیے مسیحا بنوں۔ میں بھی ان کروڑوں انسانوں میں سے ایک ہوں جو زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی انہیں مہلت نہیں ہے۔ سب کے چہروں پر بظاہر اطمینان ہے، پھر میں کیوں بے چین ہوں جبکہ میں بھی ان کا ایک حصّہ ہوں۔ وہ ہر لمحہ یہی سوچتا رہتا تھا سوچنا اس کی عادت بن گئی تھی، سچ یہ ہے کہ جو سوچتے ہیں ان کی زندگی تنگ ہو جاتی ہے۔ وہ بھی اپنے آپ کو تارِ عنکبوت میں اُلجھا ہوا محسوس کر رہا تھا اور جنات کا کوئی راستہ اسے دکھائی نہ دیتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی یہ الجھن غصّہ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ اپنے غصّہ کی تپش سے ہر اس برائی کو جلا کر خاک کر دینا چاہتا تھا جو ناقابل برداشت تھی۔ لیکن اس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ بے بس تھا اور لاچاری اس کے اندر آتش فشانی لاوا اکٹھا کر رہی تھی۔

پھر ایک دن وہ گوتم نہ ہوتے ہوئے بھی گوتم کی طرح نکل کھڑا ہوا، گیان کی تلاش میں نہیں بلکہ ایسا غیبی قوت حاصل کرنے کے لیے، جس سے وہ اپنے غصّہ کا اظہار کر سکے۔ اس کا مقصد زندگی سے فرار نہیں تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ کہیں تنہائی میں خدا کو اُکتا دینے والی ریاضت کرے گا تاکہ مجبور ہو کر خدا اس سے معلوم کرے کہ تو کیا چاہتا ہے پھر وہ خدا سے مانگے گا ایک ایسی غیبی قوت جو اس کے غصّہ کا اظہار کر سکے۔ اپنے دل و دماغ میں خدا سے ملاقات کا منصوبہ لے کر وہ موسیٰ کی طرح طور کی تلاش میں چل دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی خواہش مضحکہ خیز ہے اور اس کی کوشش دیوانگی۔ لیکن کبھی کبھی آدمی دانستہ طور پر بھی جنونی حرکات کرتا ہے۔ غرض کہ وہ بہت عرصہ تک اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ پھر ایک دن یوں ہوا کہ ایک درخت کے سائے میں ناکام و نامراد بیٹھا ہوا تھا کہ ایک سفید ریش بزرگ رونما ہوئے اور فرمایا:

''اے فانی انسان تو اس چند روزہ زندگی کو کیوں اپنے لیے وبال بنا رہا ہے۔''

اس نے حیرانی سے بزرگ کو دیکھا اور دو زانوں ہو کر کہا۔

''اے خدا آگاہ میں اس دنیائے فانی میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ ناقابل برداشت ہے۔ میرے اندر غصے کی ایک آگ پھیلی ہوئی

ہے۔ غصہ آنا فطری بات ہے لیکن اس دور کے انسان کو برائی دیکھ کر بھی غصّہ نہیں آتا۔‘‘

’’ہر چیز کی زیادتی احساس کومار دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج کا انسان برائی کو پہچانتے ہوئے بھی محسوس نہیں کرتا۔ تم کیوں پریشان ہوتے ہو، تم بھی بے حس ہو جاؤ تمہاری پریشانی دُور ہو جائے گی۔‘‘ یہ مشورہ دیتے وقت بزرگ کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ اُس نے نفی میں سر ہلایا اور کہا۔

’’نہیں ـــمیں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں بُرائی ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اے پیر و مرشد مجھے ایک ایسی غیبی قوت چاہیے جس سے میں برائی کو ختم کر دوں کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟‘‘

’’تم کس کس برائی کو ختم کرو گے لیکن اگر تم چاہتے ہو تو داہنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو۔‘‘

بزرگ کے کہنے پر اس نے اپنا داہنا ہا تھا ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ انہوں نے پوری قوت سے اس کی ہتھیلی کو اپنی ہتھیلیوں میں دبایا اور فرمایا:

’’جا اب تیری اس ہتھیلی میں فنا کرنے کی قوت آ گئی ہے تو جس کی طرف بھی ہتھیلی کا رُخ کرے گا وہ جل کر خاک ہو جائے گا۔ لیکن یاد رکھ کہ اس کا استعمال تو صرف ایک بار کر سکے گا۔ جا تجھے دنیا میں جو لوگ سب سے زیادہ بُرے لگیں انہیں جلا کر راکھ کر دے۔‘‘

اتنا کہہ کر وہ بزرگ اس کی آنکھوں سے روپوش ہو گئے۔ اس نے اپنے داہنے ہاتھ کی ہتھیلی کو دیکھا۔ خوف اور خوشی کے عالم میں فوراً ہی اس نے ہتھیلی کو چھپا لیا۔ اب وہ خوش تھا کہ اس نے اپنی مُراد پالی تھی۔

جب وہ شہر میں واپس لوٹا تھا تو اس نے اپنا داہنا ہاتھ اپنی جیب میں چھپا لیا تھا اسے ڈر تھا اگر کسی کو اس کی غیبی طاقت کا علم ہو گیا تو اس کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ اس نے اسی لیے اس بات کو کسی کے روبرو ظاہر نہیں کیا تھا کہ بعض باتوں کا اظہار موت کا سبب بھی بن جاتا ہے۔ اسے یہ بھی خوف تھا کہ کہیں کسی ناقابل برداشت شے کو دیکھ کر اس کا ہاتھ اس طرف نہ اٹھ جائے اسی لیے اس نے ایک دستانہ پہن لیا تھا۔

اب اسے تلاش تھی اس بدترین منظر کی، جو انسانیت کے لیے بد نما داغ ہو، تاکہ وہ اپنے غصّہ کا اظہار کر سکے۔ اُس نے فیصلہ کیا تھا کہ سب سے پہلے کریہہ منظر کے لیے وہ غیبی قوت کو استعمال کرے گا۔ یوں تو ہر جگہ دل کو تکلیف دینے والے منظر دکھائی دے رہے تھے لیکن ان میں سے بیشتر کو دیکھتے دیکھتے وہ بھی نظر انداز کرنے لگا تھا۔ پھر ایک دن اس نے دیکھا کہ ایک شہر میں مذہب کے نام پر فساد ہو گیا ہے۔ ہر طرف چیخ و پکار مچی ہوئی ہے ،ا یک فرقہ دوسرے فرقہ کے افراد کو بے دردی سے قتل کر رہا ہے ایک دوسرے کے گھروں کو آگ لگا رہیں۔ اس بھیانک منظر میں جو بات اُسے غصّہ دلا رہی تھی وہ یہ تھی کہ کچھ دیوانے لوگ جوان لڑکیوں کو گھروں سے نکال کر سڑکوں پر لے آئے تھے اور ان کے کپڑوں کو تار تار کر کے ان کی عزّتیں برباد کر رہے تھے۔ درندگی کے اس عالم کو دیکھ کر وہ تیش میں آ گیا تھا اور چاہتا تھا کہ غیبی طاقت کا استعمال کرے لیکن یہ سوچ کر رُک گیا کہ ابھی اس سے زیادہ گھناؤنے منظر رونما ہوں گے، اس نے اپنے غصّہ کو ضبط کیا اور آنکھیں بند کر کے آگے چل دیا۔

آگے پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک مقام پر مرد عورت اور معصوم بچوں کی بہت سی لاشیں پڑی ہیں پاس ہی ایک خالی بس کھڑی ہوئی ہے اُس نے قریب جا کر معلوم کیا کہ یہ سب کیسے ہوا؟ ایک شخص نے ڈرتے ہوئے اُسے بتایا کہ کچھ وحشی لوگوں نے بس روک کر بغیر کسی سبب کے ان بے گناہوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ یہ سن کر اس کے داہنے ہاتھ کی ہتھیلی کھلنے کے لیے بے چین ہو گئی، اس نے پھر ایک بار ضبط کیا اور آگے بڑھ گیا یہ دیکھنے کے لیے کہ ابھی اور کیا کیا دیکھنا ہے اور پھر اس نے دیکھا کہ اچانک کئی عمارتوں میں بموں کے دھماکے ہوئے اور ان دھماکوں کے ساتھ عمارتیں اور ان کے اندر موجود افراد پرزے ہو کر بکھر گئے، اس نے دریافت کیا، ان کا قصور کیا تھا؟ معلوم ہوا ـــکچھ نہیں ـــغصّہ کی حالت میں اس کا ہاتھ جیب سے باہر آ گیا۔ لیکن اس نے پھر ضبط کیا۔

اس کی بے چینی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی، اب اس کی پریشانی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے پاس غیبی طاقت کے استعمال کا صرف ایک موقع تھا اور ہر منظر اسے بدترین دکھائی دے رہا تھا، اسی پریشانی کے عالم میں اس نے پھر دیکھا کہ کچھ سپاہی ایک آدمی کو گرفتار کر کے لے جا رہے ہیں معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ وہ آدمی مسلسل اپنی بیٹی کی عصمت لوٹتا رہا تھا، دوسری جانب اس نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایک دو سالہ معصوم بچی کی لاش کو ہاتھوں پر اٹھا کر لے جا رہے ہیں جب اس نے موت کا سبب معلوم کیا تو ایک شخص نے بتایا کہ ایک ظالم نے اس معصوم کو اپنی ہوس کا شکار بنایا، جس کے صدمے سے اس کی موت ہو گئی۔ اس نے اپنے غصّہ کو دبانے کے لیے اپنی انگلیوں کو بھینچ لیا اور تیزی سے آگے بڑھا، ایک مکان کے قریب اسے نسوانی چیخیں سنائی دیں، اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا ایک نوجوان عورت کو کچھ لوگ جلا رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ یہ تیرے کم جہیز لانے کی سزا ہے تیرے جلنے سے لوگ عبرت حاصل کریں گے اور اپنی بیٹیوں کو کم جہیز دے کر رخصت نہیں کریں گے۔‘‘

اس کا چہرہ غصّہ سے تمتمانے لگا وہ تیزی سے جنگل کی طرف بھاگا کہ انسانوں کے اس شہر میں حیوانی معاشرہ پل رہا تھا۔ وہ بہت دیر تک سوچتا رہا کہ سب سے بدتر اور گھناؤنا منظر کون سا تھا لیکن اُسے سب ہی منظر گھناؤنے اور قابلِ نفرت لگے۔ وہ سب کو جلا کر راکھ کر دینا چاہتا تھا لیکن یہ نا ممکن تھا۔ بالآخر اُسے ایک ہی راستہ سُجھائی دیا بہت غور و فکر کے بعد اُس اپنے داہنا ہاتھ جیب سے باہر نکالا، ہاتھ چڑھے ہوئے دستانے کو اُتار اور اپنے غصہ کا اظہار کرنے کے لیے اپنی ہتھیلی کا رُخ اپنی ہی جانب کر دیا۔

***

سفر

بچّوں کے بے حد اصرار پر اُس نے ایل ٹی سی کے لیے اپنے آفس سے ایڈوانس لے ہی لیا۔ نہ جانے کیوں وہ اندر سے خوفزدہ تھا اُس کا دل نہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی شہر اور اپنا گھر چھوڑ کر کہیں بھی جائے اور بھی بچّوں کے ساتھ لیکن دوسرے لوگوں کو دیکھ کر اُس کے بچّوں نے اسے اس سفر کے لیے مجبور کر دیا تھا، اس کی بیوی بھی اس بات سے زیادہ خوش نہیں تھی ایک انجانا سا خوف تھا جو ان کی خوشیوں کے اوپر منڈ لا رہا تھا، اگر انسان آنے والے حادثات کے بارے میں سوچتا رہے تو شاید کبھی آگے نہ بڑھ سکے، لیکن خیالات اور خیالات کے اِرد گرد منڈ لانے والے خدشات آدم کے اپنے اختیار میں کہاں ہوتے ہیں۔ خواب آدمی اس لیے دیکھتا ہے کہ نہ دیکھنا اس کے اختیار میں نہیں۔ اس کے والدین بھی اس بات کے لیے تیار نہیں تھے کہ وہ دور دراز کا سفر اختیار کرے۔ اس کے باپ نے کہا تھا ''بیٹے ان دونوں حالات ایسے نہیں ہیں کہ تم بچّوں کے ہمراہ طویل سفر کرو لیکن وہ بچّوں کی ضد اور خواہش کے آگے بے بس تھا۔ نو جوان ذہن کے پاس سوچنے کے لیے وقت بہت کم ہوتا ہے ہر وقت کچھ کر گزرنے کا جذبہ انہیں بے چین کیے رہتا ہے۔ اندیشوں سے جو ان خون بے نیاز ہوتا ہے۔

بالآخر سب کی سفر کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ وہ پانچ افراد تھے۔ ایک جوان بیٹی اور دو جوان ہوتے ہوئے بیٹے ان کے ساتھ تھے۔ چاروں بہت خوش تھے۔ سب کے بیگ اور سوٹ کیس علاحدہ علاحدہ تیار ہو گئے تھے۔ کیمرہ ٹیپ ریکارڈ، رسائل غرض کہ سفر کا لطف حاصل کرنے کے لیے سب کچھ ساتھ لے لیا تھا۔ روزانہ ایٹلس دیکھ کر مقامات کے نام یاد کر رہے تھے کہ کس کس مقام پر کیا دیکھنا ہے، محکمہ سیر و سیاحت سے کافی معلومات اکٹھی کر لی تھیں اور جس روز وہ اس پندرہ روزہ سفر کے لیے جانے لگے تھے تو انہیں رُخصت کرنے کے لیے سبھی عزیز و اقرباء اس کے گھر آئے تھے۔ یہ اس کی زندگی کے سب سے طویل سفر کی روانگی تھی۔ کوئی سمجھا رہا تھا۔

''دیکھو بچوں کو ٹرین سے نیچے نہیں اُترنے دینا۔''

کوئی کہہ رہا تھا۔

''بھئی رات وات میں کھڑکیاں بند رکھنا۔ آج کل حالات ایسے نہیں ہیں کہ بے فکری سے سفر کیا جا سکے۔ آخر دہشت گرد ٹرینوں پر رات ہی میں حملہ کرتے ہیں''

کسی نے مشورہ دیا۔

''دیکھو راستے میں کسی کو اپنے نام نہیں بتانا۔ پچھلے مہینے جو ٹرین روک کر کچھ لوگوں کو مارا تھا تو پہلے اُن کے نام ریزرویشن چارٹ میں دیکھ لیے تھے۔ ویسے موقع ملے تو دو تین اسٹیشن نکلنے کے بعد وہ چارٹ ہی وہاں سے ہٹا دینا پھر تو اس کی ضرورت بھی نہیں رہتی''

کسی نے ایک اور دور اندیشانہ بات کہی۔

''ریزرویشن میں اگر تم مجہول نام لکھاتے تو زیادہ اچھّا رہتا جیسے پنکی، گڈّی، ٹونی۔''

ان سب باتوں سے اس کی بیوی کے دل میں خوف کی پرچھائیاں گہری ہوتی جا رہی تھیں اور اس کا اظہار اس نے اس طرح دبے الفاظ میں کیا تھا۔

''میرا تو دل گھبرا رہا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم اگلے سال چلیں۔''

اپنی شریک حیات سے یہ بات سن کر وہ جھنجھلا سا گیا اگرچہ وہ خود بھی خوفزدہ تھا۔

''کیا بچّوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ تھوڑی دیر بعد اسٹیشن جانا ہے سب تیاری ہو چکی ہے اور تم اگلے سال کی بات کر رہی ہو۔

بہت لوگ جا رہے ہیں جو ہو گا سب کے ساتھ ہو گا اور اسی طرح موت لکھی ہے تو کوئی روک لے گا جاؤ دیکھو کوئی چیز رہ نہ جائے۔''

اور پھر جس وقت وہ گھر سے نکلے تھے تو حفاظت اور سفر کی جتنی دعائیں پڑھ سکتے تھے پڑھ لی تھیں۔ اور وہی تمام دعائیں ٹرین کے روانہ ہونے سے پہلے دہرا لی تھیں۔ وہ اس طرح سب سے اپنی خطائیں معاف کرا کے رخصت ہوئے تھے جیسے سمندری جہاز سے سفر کر رہے ہوں اور کولمبس کی طرح بھٹکنے کا اندیشہ ہو۔ عجیب بات تھی کہ یہ خوف بچّوں کے دلوں پر نہیں تھا۔ شاید بڑھتی ہوئی عمر آدمی کو بزدل بنا دیتی ہے۔ نہیں طویل عمر کا طویل مشاہدہ سنجیدگی پیدا کر دیتا ہے۔ وہ سب فرسٹ کلاس کے ایک کیبن میں سفر کر رہے تھے۔ چھ افراد ہونے کی وجہ سے باہر کا کوئی مسافر ان کا ہم سفر نہیں تھا۔ اس کی بیوی اس بات سے بہت مطمئن تھی کہ آرام سے اپنا کیبن بند کر کے سوئیں گے۔ وہ پہلی بار فرسٹ کلاس سے سفر کر رہے تھے۔ یوں بھی متوسط طبقہ کا آدمی اسی وقت فرسٹ کلاس سے سفر کرتا ہے جب کوئی اور ٹکٹ کی رقم ادا کرے۔ ورنہ ٹرین میں لگے ہوئے فرسٹ کلاس کے ڈبّے وہ اس طرح چھوڑتا چلا جاتا ہے جیسے وہ ٹرین کا حصہ ہی نہ ہوں۔ وہ سب کیبن کی ایک ایک چیز کو بغور دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنا سامان سیٹ کر لیا تھا۔ ٹرین چلنے لگی۔ انہیں جنوب کی سمت جانا تھا۔ عام طور پر لوگ راس کماری تک جو ہندستان کا آخری شہر ہے سفر کا ارادہ رکھتے ہیں

اس طرح رقم بھی زیادہ سے زیادہ مل جاتی ہے اور پورے جنوبی ہندستان کی سیر بھی ہو جاتی ہے۔ وہ جب گھر سے چلے تھے تو اپنے چہروں سے وہ تمام علامتیں ہٹا دی تھیں جس سے کسی خاص مذہب کی شناخت ہو۔ وہ جانتا تھا کہ مذہب علامتوں کا نہیں دل سے تسلیم کرنے کا نام ہے۔ ہم سب لامذہب ہیں جس کی وجہ سے پوری دنیا میں بدامنی پھیلی ہوئی ہے۔ مذہب تو امن اور بھائی چارگی کی تعلیم دیتا ہے۔ ٹرین تیزی سے اسٹیشنوں کو چھوڑتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ قریب چار گھنٹے سفر کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ اب ہم آگرہ پہنچ چکے ہیں۔ سب نے کھڑکیوں سے جھانکا کہ شاید گنگا جمنی مشترکہ تہذیب کا پیکر تاج محل انہیں نظر آ جائے۔ لیکن تاج محل متھرا کی جانب سے آنے والی ریفائنریز کے دھوئیں سے چھُپ گیا تھا۔ ٹرین آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے اپنے بچوں کو بتایا کہ ہماری ٹرین گوالیار، جھانسی اور چمبل کی گھاٹیوں سے بھی گذرے گی۔ چمبل کا نام سن کر کوئی ڈاکوؤں کے خوف سے سہما نہیں۔ اب تو شہر میں چمبل کے ڈاکوؤں سے زیادہ خطرناک ڈاکو موجود ہیں لُوٹ مار اور قتل و غارت گری ان گھاٹیوں کے رہنے والوں سے زیادہ شہروں میں رہنے والے کرتے ہیں۔

رات بڑھتی جا رہی تھی۔ انہوں نے دروازہ بند کر لیا تھا کہ اندھیرے کے ساتھ ساتھ خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ بچّے سفر کا لطف اٹھا رہے تھے لیکن اس کی بیوی بے چین سی تھی گیلری میں قدموں کی آہٹ بھی اسے چونکا دیتی تھی۔ ہر لمحہ اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ابھی کیبن کا دروازہ کھول کر کچھ لوگ اندر داخل ہوں گے اور پوچھیں گے تمہارا نام کیا ہے۔ پھر کہیں گے نیچے اُترو اور پھر ...... وہ سوچ کر گھبرا رہی تھی۔ وہ سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے اپنے چہرہ پر اطمینان کا غلاف اوڑھے ہوئے تھا کیوں کہ اس کے خوف زدہ ہونے سے سب کی ہمتیں ٹوٹ جاتیں۔ اچانک قدموں کی چاپ کیبن کے دروازے تک آئی اور دروازے پر آ کر ٹھہر گئی اور جب دستک ہوئی تو وہ سب چونک گئے۔ اس کی بیوی کے ہونٹ تیزی سے دعائیں پڑھنے لگے۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ دروازے کے باہر ٹکٹ چیکر کھڑا ہوا تھا۔ وہ ٹکٹ دیکھ کر چلا گیا۔ سب نے سکون کی سانس لی اور پھر سب اپنے اپنے شغل میں مشغول ہو گئے۔ کچھ دیر بعد یکایک نہ جانے کہاں ٹرین رُک گئی۔ اور اسی کے ساتھ انہیں اپنی سانسیں بھی ٹھہرتی ہوئی محسوس ہوئیں اسے اور اس کی بیوی کو وہ ساری خبریں یاد آ گئیں جو ٹرین کے حادثات سے متعلق تھیں۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اب تھوڑی دیر میں دہشت گرد ٹرین میں گھس آئیں گے اور پھر ......ان کا ذہن آگے باتیں سوچنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ان سب نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا دور دور تک اندھیرے کی چادر پھیلی ہوئی تھی۔ پھر دروازے کی دستک سے کپکپانے کی حد تک چونک گئے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ دروازہ کھولے یا نہیں کہ پھر دستک ہوئی۔ اس نے اٹھنا چاہا تو اس کی بیوی نے ہاتھ پکڑ لیا وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی کہ تیسری بار دستک کے ساتھ آواز آئی۔

''کھانے والا''۔

ایک بار پھر اطمینان ان کے چہروں پر لوٹ آیا۔ اس نے دروازہ کھولا۔

''سر صبح کے ناشتہ کے لیے۔''

''ہاں بھئی چھ پلیٹ آملیٹ سلائس لے لینا۔ یہ ٹرین کیوں رک گئی۔''

''کچھ نہیں سر اگلے اسٹیشن سے سگنل نہیں ملا ہے بس چلنے والی ہے۔''

وہ اپنی بات کہہ کر آگے بڑھا ہی تھا کہ ٹرین چلنے لگی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ ایسا ماحول تو پہلے کبھی نہیں تھا اسے اتنا خوف کبھی محسوس نہیں ہوا تھا ایسا کیوں ہوا کہ ہر آدمی آزادی سے گھومتے ہوئے ڈرنے لگا ہے۔ آدمی نے کیوں خود کو بموں کے ڈھیر پر بٹھا لیا ہے۔ کیوں ہر وقت ایسا لگتا ہے کہ آئندہ لمحوں میں بم پھٹنے والا ہے۔ کیوں اسے اپنی بٹیوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے ہر پل آنکھوں کو کھلا رکھنا پڑ رہ

ہے۔ شاید مہذب کہلانے والے انسان کا ہزاروں سال پہلے وحشیانہ پن پھر لوٹ آیا ہے۔ نہ جانے کب وہ سوچتے سو گیا اور جب آنکھ کھلی تو آفتاب کی کرنیں کھڑکی کے شیشے سے ٹکرانے لگی تھیں اس کی بیوی اس طرح بیٹھی تھی جیسے رات بھر جاگتی رہی ہو کتنا اچھا لگ رہا تھا ٹرین سر سبز کھیتوں کے بیچ سے گزر رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ درخت پر مختلف النسل پرندے چہچہا رہے ہیں سب کے رنگ اور بولیاں الگ الگ ہیں۔ اسے پرندوں کی زندگی پر رشک آیا۔

اُن کی پہلی منزل قلی قطب شاہ اور رانی بھان متی کی محبت کا نگر حیدرآباد تھی۔ وہ حیدر آباد کی ایک ایک یاد گار بغور دیکھ رہے تھے لیکن ایک خوف اُن کے آگے آگے چل رہا تھا اور اندیشہ اُن کے تعاقب میں تھا کہیں بھی لوگوں کا مجمع دیکھ کر وہ ڈر جاتے تھے۔ ڈر ان کا سایہ بن گیا تھا۔ وہ اسی خوف کے ساتھ پندرہ روز تک جنوبی ہندستان کے مختلف شہروں میں گھومتے رہے۔ اس کے بچّوں نے یاد گار مقامات کو اپنے کیمرے میں قید کر لیا تھا۔ ہر شہر کی کوئی نہ کوئی یادگار خرید لی تھی۔ ان کی آخری منزل بمبئی تھی اور وہیں سے واپس گھر لوٹ جانا تھا۔ وہ سبھی بمبئی کی رنگینیوں کو جی بھر کے دیکھنا چاہتے تھے لیکن موت کے خوف نے اس بمبئی پر سنّاٹے کی چادر تان لی تھی جو رات کو جاگتی تھی۔ وہ بہت جلد اب اپنے سفر کو ختم کر کے گھر پہنچ جانا چاہتے تھے۔ وہ اس بات سے خائف تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ گزشتہ پندرہ روز کی خوشگوار یادیں تلخی میں تبدیلی میں ہو جائیں اس لیے سمندر کی موجوں سے رخصت ہو کر اپنے شہر کے لیے روانہ ہوئے۔

اسٹیشن پر اُتر کراس نے اور اس کی بیوی نے سب سے پہلے شکر ادا کیا اور جب باہر آ کر ٹیکسی والے سے چلنے کے لیے کہا تو ڈرائیور نے غور سے انہیں دیکھا جیسے وہ پہلی بار اس شہر میں آئے ہوں۔

’’کیا صاحب آپ کو پتہ نہیں اُس علاقہ میں تو پرسوں بڑا زبردست رائٹ ہوا ہے آج چار گھنٹے کی کرفیوں میں ڈھیل دی ہے جلدی پہنچ لو ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔‘‘

وہ سب ایک دم سکتے میں آ گئے۔ اس نے دو دن کے سفر میں اخبار نہیں دیکھا تھا۔ اگر آدمی اخبار نہ پڑھے تو کتنا مطمئن اور بے خبر رہتا ہے۔ پھر اس نے زیادہ وقت خراب کرنے کے بجائے ٹیکسی والے کی خوشامد کی۔ پھر جلدی جلدی ٹیکسی میں سوار ہوئے۔ وہ ٹیکسی والے سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن صرف اتنا پوچھ سکا کہ جھگڑا کس بات پر ہوا۔

’’پورے ملک کی فضا اتنی خراب چل رہا ہے صاحب کہ بغیر کسی بات کے جھگڑا ہو جاتا ہے۔ لیکن بہت نقصان ہوا۔ کئی لوگ مارے گئے۔ بہت سے گھر اور دکانیں جل گئیں‘‘۔

اس کی کالونی کے چاروں طرف فوج گشت کر رہی تھی۔ حیران و پریشان لوگ جلدی جلدی ضروری اشیا خرید رہے تھے۔ افراتفری کا عالم تھا۔ وہ ڈرائیور کو اشارے سے بتاتا ہوا اپنے گھر کی طرف سے چلا۔ جگہ جگہ جلی ہوئی دکانیں اور مکان فساد کی کہانی سنا رہے تھے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ٹیکسی والے کو رکنے کے لیے کہا وہ نیچے اترا، سامنے فوج کا پہرہ تھا اور ان فوجیوں کے پیچھے اس کا جلا ہوا مکان تھا۔ اپنے جلے اور لُٹے ہوئے مکان کو دیکھ کر ان سب کی چیخیں حلق کے اندر ہی پھنس گئیں۔ وہ کسی سے کچھ نہ پوچھ سکا اسے دیکھ کر اس کا ایک پڑوسی اس کے قریب آیا اور کہنے لگا۔

’’تم اب آئے ہو اگر فوج نہ آتی تو یہ جلی ہوئی دیواریں بھی شاید نہ بچتیں۔‘‘

اُس نے کوئی سوال نہیں کیا تھکے ہوئے قدموں سے ٹیکسی میں آ کر بیٹھ گیا اور ڈرائیور سے کہا۔

’’ہمیں ایک بار پھر اسٹیشن پہنچا دو۔‘‘

* * *

لکڑ بگھا زندہ ہے

آس پاس کے علاقہ کے لوگ بھی سہم گئے تھے۔ مائیں اپنے بچّوں کو گھر سے باہر نکلنے نہیں دیتی تھیں۔ عام طور پر لوگ شام ہوتے ہی گھر کے دروازے کھڑکیاں بند کر لیتے تھے، یوں بھی سردیوں کی رات میں خوف زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہر جاندار سردی سے بچنے کے لیے رات کا شامیانہ کھلتے ہی محفوظ مقام پر چلا جاتا ہے۔ سڑکوں اور گلیوں میں سناٹا رینگنے لگتا ہے۔ ہوا یوں تھا کہ ایک رات جمنا کے کنارے ریت کے ٹیلے پر ایک بچّے کا کٹا ہوا سر ملا۔ تھوڑی تلاش کے بعد اس کے بعد اس کے بدن کے دوسرے اعضا ء بھی مل گئے اور جب لاش کے پاس ہی جانور کے پیروں کے نشان دیکھے گئے تو یہ خبر بہت تیزی سے پھیل گئی کہ اس بچے کو لکڑبگھے نے مارا ہے کیوں کہ پنجوں کی ساخت لکڑ بگھے سے مشابہ تھی۔ خبر کے

پھیلتے ہی شہادتیں خود بخود ملتی چلی گئیں۔ ایک شخص نے کہا۔
''ہاں رات کو جب میں پانی پینے کے لیے اُٹھا تھا تومیں نے دیکھا کہ کُتّے جیسا ایک جانور کسی چیز کو کھینچے لیے جا رہا ہے۔ اس کے پیروں سے چَٹ چَٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ لکڑ بگھّا ہی تھا۔ اسی کے چلنے سے چَٹ چَٹ کی آواز آتی ہے۔''
ایک اور شخص کے کہنے لگا۔
''میں نے بھی رات کو کتّوں کی آوازیں سُنی تھیں۔ کتّے بہت زور زور سے بھونک رہے تھے۔''
اس طرح کی بہت سی شہادتیں ملنے پر یقین ہو گیا تھا کہ واقعی بستی میں لکڑ بگھا آ گیا ہے بعض ماہرین نے بھی بچے کی لاش کو دیکھ کر اس بات کی تصدیق کی، پھر کیا تھا لکڑ بگھے کا خوف ہر چھوٹے بڑے پر غالب آ گیا اس لیے کہ لکڑ بگھے کے آدم خور ہونے کی کہانیاں سب نے سنی تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ لکڑ بگھا دیکھا کسی نے نہیں تھا اور دیکھتے بھی کیسے؟ وہ سب شہر میں رہنے والے تھے جنگل اور جنگل کے وحشیانہ پن سے دور —انسانوں کے درمیان—
شہر میں لکڑ بگھے کا آنا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا، اسی لیے اخباروں نے اس خبر کو بڑی اہمیت دی۔ اخباروں کی چھپی ہوئی خبریں دل پر نقش ہو جاتی ہیں۔ ان کی صداقت کو بہت کم لوگ چیلنج کرتے ہیں اس لیے کہ سچ بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ اخبار میں چھپنے کے بعد معاملات سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ لکڑ بگھے کے واقعے کو بھی بڑی سنجیدگی سے لیا گیا۔ حکومت اس کے لیے متفکر ہوئی۔ شہر میں لکڑ بگھے کی آمد کی وجہ جاننے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ قیاس یہ کیا گیا کہ جنگلات کے راستے بہہ کر آنے والی جمنا کے پانی میں بہتا ہوا لکڑ بگھا شہر آ پہنچا ہے اور اب شہر میں جنگل نہ ہونے کی وجہ سے اسے کوئی چھپنے کی جگہ نہیں مل رہی اور جھنجھلاہٹ میں بار بار حملے کر رہا ہے۔ وارداتوں کی افواہیں دن بدن بڑھتی جا رہی تھیں۔ حکومت نے اس علاقہ میں خصوصی حفاظت کا انتظام کیا تھا کہ جہاں پہلی واردات ہوئی تھی۔ ہر طرف بندوقوں سے لیس سپاہی گشت کرتے رہتے تھے۔ خود بستی کے لوگوں نے اپنے حفاظت کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتے ہوئے باری باری جاگنا شروع کر دیا تھا۔ لکڑ بگھے جیسی شکل و صورت رکھنے کی وجہ سے نہ جانے کتنے بے گناہ کتے رات کے اندھیرے میں پولیس کی گولیوں کا شکار ہو گئے تھے۔ تمام حفاظتی انتظامات کے باوجود وارداتیں پھر بھی ہو رہی تھیں۔ لکڑ بگھے کی وارداتوں کا علاقہ پھیلتا جا رہا تھا۔ حکومت انتظام سے اور عوام خوف سے پریشان تھے۔ پورے علاقہ میں خوف کی فضا پھیل گئی تھی۔ ہر شخص کو اپنے پیچھے لکڑ بگھے کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی تھی۔ سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ لکڑ بگھا پیچھے سے حملہ کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ وفادار کتے کی طرح پیچھے پیچھے چلتا ہے، لوگ چلتے وقت آگے کم، پیچھے زیادہ دیکھنے لگے تھے۔ ہر آہٹ پر ڈر جاتے تھے۔
خوف کے اسی ماحول میں ایک دن بہت سویرے یہ خبر پھیلی کہ آج رات پولیس کی گولی سے لکڑ بگھا مارا گیا اور اس کی لاش پولیس اسٹیشن میں نمائش کے لیے رکھی گئی ہے۔ پھر کیا تھا پورا علاقہ اس طرف کو چل دیا۔ بچّے، جوان، عورت، مرد سبھی لکڑ بگھے کو دیکھنا چاہتے تھے۔ لوگوں کا سیلاب اُمڈ پڑا تھا، پولیس اسٹیشن کے سامنے میدان میں لکڑ بگھے کی لاش پڑی تھی۔ اس کے بدن پر بہت سی گولیوں کے نشان تھے۔ لکڑ بگھے کی لاش کو دیکھ کر پولیس کا سر فخر سے بلند تھا کہ انہوں نے اپنی دانست میں بہت بڑا کام انجام دیا ہے۔ اسی وقت ماہرین کی ایک جماعت بھی لکڑ بگھے کی شناخت کے لیے وہاں پہنچی۔ انہوں نے لاش کو بغور دیکھا۔ اس کے تمام اعضاء کا معائنہ کیا۔ پھر آپس میں کچھ بات چیت کی اور فیصلہ کیا کہ
''یہ لکڑ بگھا نہیں ہے یہ تو عام ....''
اتنا سنتے ہی لوگوں نے محسوس کیا کہ ان کے پیچھے چٹ چٹ کی آواز آ رہی ہے۔ سب نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ٹھیک اسی وقت ہجوم کے بیچ میں زبردست بم کا دھماکہ ہوا۔ انسانی گوشت کے لوتھڑے ہوا میں پھیل گئے۔ لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ اسی بھیڑ میں سے ایک بچہ چیختا ہوا اپنے گھر کی طرف بھاگا ''دروازے کھڑکیاں بند کولو۔ لکڑ بگھا ابھی زندہ ہے۔''
***

ابن آدم

ہر روز کی طرح کمرے کی دیوار پر لگے ہوئے بلب کے نیچے دو موٹی موٹی چھپکلیاں بار بار منہ کھول کر بے بس کیڑوں کی

نگل رہی تھیں اور وہ دونوں بھی ہر روز کی طرح اپنے تھکے ہارے جسموں کو لے کر بے جان کرسیوں پر آن پڑے تھے۔ پھر ایک نے دوسرے سے سوال کیا:

''تم نے آج کیا دیکھا؟ دوسرا کہنے لگا:

''میں نے آج دو عجیب منظر دیکھے۔ تم کہو، تم نے کیا دیکھا؟''

''آج میری نظروں سے بھی کئی عجیب حادثے گزرے لیکن پہلے تو بیان کرو کہ تم نے کیا دیکھا؟'' وہ کہنے لگا:

''میں نے دیکھا کہ ایک بارہ تیرہ سال کی لڑ کی سڑک پر جا رہی ہے اچانک پانچ نوجوان آدمی اس کے پاس آئے اور اسے پکڑ کر لے گئے۔ پھر جو کچھ میں نے دیکھا اسے بیان کرنے کی زبان کو طاقت نہیں۔ میری آنکھوں میں ابھی تک اس بے بس لڑکی کی چیخیں گونج رہی ہیں۔ میں سب کچھ دیکھتا اور سنتا رہا لیکن نہ جانے کیوں کچھ نہیں کر سکا۔''

دوسرے نے افسوس کا اظہار کیا۔

''افسوس آدمی درندہ بنتا جا رہا ہے۔ اس درندگی کا ایک دہشت ناک منظر میری نگاہوں کے سامنے پیش آیا ...... ایک مقام پر مختلف قوم کے دو افراد میں کسی بات پر جھگڑا ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ جھگڑا اتنا بڑھا کہ دو قوموں کی لڑائی میں بدل گیا۔ چاقو، تلواریں، بھالے، بندوقیں نکل آئیں، جسم کٹنے لگے، خون بہنے لگا، وہاں جوان بوڑھے، مرد عورت کا فرق نہیں تھا۔ ہر ایک کو مارا جا رہا تھا، کاٹا جا رہا تھا۔ برسوں جو ساتھ رہے، آس پاس دوست بن کر رہے، ایک دوسرے کو بڑی بے دردی سے کاٹنے لگے۔ عورتوں کی عزتیں اور بچوں کی لاشیں اُچھلنے لگیں۔ اور ایک منظر دیکھ کر تومیں کانپ گیا۔

''وہ کیا تھا'' پہلے نے بے چینی سے پوچھا۔

''ایک حاملہ عورت جان بچانے کے لیے بھاگ رہی تھی کہ اچانک اُس پر کسی نے حملہ کر دیا اور اس کا پیٹ چاک کر کے انسان بنتے ہوئے گوشت کے لوتھڑے کو ہوا میں اچھال دیا گیا۔''

''اُف یہ بے دردی کے مظاہرے کب تک آنکھیں دیکھتی رہیں گی، کان سنتے رہیں گے۔''

''جب تک آدمی اس زمین پر موجود ہے'' دوسرے نے جواب دیا۔

''آخر جذبۂ انسانیت کہاں ناپید ہو گیا۔''

''جذبۂ انسانیت کبھی تھا ہی نہیں، انسان کوئی مخلوق نہیں۔ یہ صرف ہمارے ذہنوں کا تشکیل دیا ہوا ایک تخیلی نام ہے۔ یہاں تو صرف ابن آدم کی حکومت ہے۔ ہابیل قتل کیا جاتا رہے گا، قابیل ہمیشہ زندہ رہے گا۔ کیا تم نے کوئی انسان دیکھا ہے؟''

''ہاں''

''کہاں ہے وہ؟'' دوسرے نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

''وہ .....وہ........ نہیں! میں نے نہیں دیکھا، میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔''

''جو شے نہیں ہے اسے دیکھا بھی کیسے جا سکتا ہے۔''

سچ! انسان ایک آئیڈیل کا نام ہے، تم نے اور کیا دیکھا؟''

''کیا کیا سنو گے، تم سنتے سنتے تھک جاؤ گے لیکن حادثات کا بیان ختم نہیں ہو گا کیا تم سنو گے کہ نوبیاہتا عورت نے سسرال کے ظلموں سے نجات حاصل کرنے لیے اپنے بدن میں آگ لگا لگی، کیا تم سنو گے کہ بے گناہ عورتوں بچوں اور مردوں سے بھری ٹرین کو بم سے اڑا دیا گیا۔ کیا تم اس بے حسی کی کہانی سنو گے کہ ایک شخص سڑک پر تڑپ تڑپ کر جان دیتا رہا اور لوگ انجان بن کر گزرتے رہے۔''

''بس کرو.... ....بس ....یہ سب کچھ میں نے بھی دیکھا ہے۔ پتہ نہیں شرافت، ہمدردی کہاں گئی ....''

''شرافت ....ہاہاہا......ہمدردی........ہاہاہا ....یہ سب الفاظ کتابوں کے ہیں ......صرف کتابوں کے۔ وہ وقت عنقریب آنے والا ہے، جب دنیا کا سب سے شریف آدمی وہ کہلائے گا جو انسانیت، شرافت، ہمدردی، دوستی، وفا جیسے الفاظ کے معنی جانتا ہو گا۔''

''ہاں بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے .... یہ آدمیوں کی دنیا ہے اور آدمی کی فطرت شر پسند ہو گئی ہے۔ چھوڑ و اس بات کو .... تم کہو تمہاری محبوبہ کیسی ہے؟'' ایک نے گفتگو کے موضوع کو بدلنے کی کوشش کی دوسرا کہنے لگا:

''بہت اچھی، تمام دنیا کی لڑکیوں سے اچھی۔''

''کیا تمہیں اس کی وفا پر یقین ہے۔''

''اتنا ہی جتنا اس بات پر کہ میں زندہ ہوں۔ وہ اپنی خوبصورتی کی طرح مجھے چاہتی ہے۔''

''وہ جھوٹ بولتی ہے .... وہ تمہیں نہیں چاہتی۔''

''نہیں تم جھوٹ بول رہے ہو....... تم اس پر الزام لگا رہے ہو۔''

''نہیں! میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ اس نے شاید کبھی تمہیں چاہا ہو گا۔''

’’وہ اب بھی مجھے پوجتی ہے۔‘‘
’’یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ وہ جان چکی ہے کہ تم صرف ایک فنکار ہو۔ جس کی جیبیں خالی ہیں۔‘‘
’’وہ دولت کو نہیں چاہتی۔‘‘
’’وہ دولت ہی کو چاہتی ہے .... تم نہیں جانتے کہ دہ دولت مند کے ساتھ رشتہ جوڑ چکی ہے۔‘‘
’’تم اس پر بے وفائی کا الزام لگا کر مجھے جوش دلا رہے ہو۔‘‘
’’تم کیا کر سکتے ہو؟‘‘
’’میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔‘‘
’’اور میں پھر بھی کہتا رہوں گا کہ وہ بے وفا ہے .....بے وفا۔‘‘
’’میں تمہیں مار ڈالوں گا۔‘‘
’’میرے بھی دو مضبوط ہاتھ ہیں۔‘‘
’’کمینے ..... میں تجھے زندہ نہیں چھوڑ دوں گا۔‘‘
دونوں ایک دوسرے سے بھڑ جاتے ہیں اور جان لینے کی حد تک لڑتے رہتے ہیں۔
انجام کار آخری سانسیں لیتے ہوئے گر جاتے ہیں۔ ایک دوسرے سے کہتا ہے۔
’’آخر تو نے مجھے مار ہی دیا۔‘‘
’’ہاں ....ہم ....دونوں نے .... ایک دوسرے کو مار ڈالا .... آخر .....ہم بھی تو آدمی ہی ہیں۔‘‘
اچانک کمرے کا بلب بجھ گیا اور وہ دونوں موٹی موٹی چھپکلیاں ان دونوں مُردہ جسموں کی خون میں لتھڑی ہوئی پشت پر آ گریں۔
***

کنّیا دان

پورا گاؤں اُمڈ پڑا تھا، بُوڑھے بچے، جوان اور عورتیں سبھی کے کان پنچوں اور پنڈتوں کا فیصلہ سُننے کے لیے بے چین اور منتظر تھے سب کو اُمید تھی کہ آج کے فیصلے کے بعد بارش ضرور ہو گی۔ آسمان پر ضرور ابر رحمت چھائے گا، کسی کو یاد نہیں تھا کہ اُس نے اپنی عمر کے کسی حصے میں ایسا بھیانک منظر دیکھا ہو کہ زمین کا سینہ
پیاس کی شدّت سے چٹخ گیا تھا۔ درختوں کے جسم ٹوٹ کر بکھر گئے تھے، کسانوں کی نظریں آسمان کی طرف دیکھتے دیکھتے پتھرا گئی تھیں۔ جانوروں نے ہانپتے ہانپتے دم توڑ دیا تھا۔ سوا نیزے پر اُترے ہوئے آفتاب کی تپش نے دریاؤں کا پانی خشک کر دیا تھا۔ کنوؤں میں اُبلتا ہوا پانی زمین کی سات پرتوں کے نیچے چلا گیا تھا۔ ہر ذی روح موت کے دہانے پر کھڑا زندگی کو حسرت سے دیکھ رہا تھا سبب صرف یہ تھا کہ چرخِ ستم گار نے ستم ہائے بے جا کا مظاہرہ کیا تھا۔ عالمِ آب و گل کو بے آب کر دیا تھا۔ ابر باراں نہیں چھایا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس بار اندر لوک کا راجا ناراض ہو گیا ہے۔ اور آج سب کو فیصلہ کرنا تھا کہ راجا اندر خوش کرنے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔ پھر ایک بزرگ نے اپنی کمزور آواز میں یوں خطاب کیا:
’’جب سنسار میں پاپ بڑھ جاتے ہیں تو ایشور مَنُشیہ کو سنکٹ میں پھنسے ہوئے ہیں اور اس سے نکلنا مشکل ہو رہا ہے کون کہتا ہے مَنُشیے نے انّتی کی ہے اور سب کچھ کرنے کے لائق ہے، یہ سراسر جھُوٹا الزام ہے، ایشور کی شکتی بڑی ہے جو وہ خود چاہتا ہے وہی کرتا ہے، ہم سب اس کی کٹھ پتلیاں ہیں۔ وہ جس طرح چاہتا ہے نچاتا ہے۔‘‘
مجمع پر سکوت طاری تھا ہر شخص ہمہ تن گوش تھا پھر ایک اور آدمی کھڑا ہوا اور کہنے لگا:
’’تم ٹھیک کہتے ہو، ہم بالکل بے بس ہیں، ہم نے اتنی ترقی کی ہے کہ چاند ستاروں کو چھو لیا ہے، دریاؤں کے رُخ بدل دیے ہیں، ہواؤں پر سفر کرنے لگے ہیں لیکن ہم آج بھی بے دست و پا ہیں کہ ہم آسمان سے ایک قطرہ بارش کانہیں برسا سکتے۔ ہماری زمینوں سے سینے پھٹ گئے ہیں ہمارے کھیتوں کی شادابی سورج کی حدّت سے جل کر راکھ ہو گئی ہے۔ اے لوگو! سوچو، غور کرو۔ اس سے پہلے کہ ہمارے جسم غلّے کی کمی کے سبب ڈھانچہ بن جائیں، خشک زبانیں سوکھے ہوئے درخت کے پتّوں کی طرح دہانوں سے نکل کر گر پڑیں۔‘‘
سب نے اپنے دانتوں کے اندر زبانوں کو محسوس کر کے دیکھا ابھی سب کی زبانیں محفوظ تھیں۔ انہوں نے باہر نکلنے کے

خوف سے اپنے دانتوں کو بھینچ لیا اور آسمان کی جانب بھیک مانگنے والی نگاہوں سے دیکھا لیکن ابرِ رحمت کا دُور دُور تک نشان نہیں تھا اور جب ان کی آنکھیں سورج کی کرنوں کی آنچ سے جلنے لگیں تو انھوں نے پھر غور کیا اور کہا۔
''ہمیں چاہیے کہ ہم سب ننگے سر تپتی ہوئی چٹانوں پر چل کر بھگوان سے پرارتھنا کریں شاید وہ ہمارے پیروں کے پھٹے ہوئے چھالے دیکھ کر کرپا کرے اور ہمارے کھیتوں کے لیے پانی برسا دے۔''
''ہاں میں مسجدوں سے رستے ہوئے خون کو دیکھ کر مہربان ہو جائے اور ہمارے کھیتوں کی شادابی لوٹا دے۔''
ایک اور شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ:
''ہم سب اپنی جوان بیٹیوں کو برہنہ سر جنگلوں میں بھیجیں تاکہ وہ اپنے بے مثال رقص سے راجہ اندر کو خوش کریں اور ہو سکتا ہے کہ راجہ اندر خوش ہو کر بے آب زمینوں کو سیراب کر دیں۔''
''بارش کا دیوتا بلی چاہتا ہے ہمیں کسی کی بلی دینی ہو گی۔''
بہت دیر تک وہ سب حیران و پریشان اور بے بس لوگ سوچتے رہے کہ کون سا راستہ اختیار کیا جائے جس سے تڑپتی زمینوں کی تشنگی دور ہو۔۔۔پھر تمام لوگوں نے مشترکہ فیصلہ کیا کہ کل صبح دو جوان کنواری لڑکیوں کے کاندھوں پر ہل رکھ کر کھیتوں میں چلایا جائے۔ یہ دیوتا کو خوش کرنے کا اہم ترین طریقہ ہو گا۔ جب عقل اور سائنس لاچار بے بس ہو جاتی ہے تو تو ہم پرستی کو زندگی ملتی ہے۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ وہ لڑکیاں کون ہوں گی۔ بہت سے لوگوں نے اپنی بیٹیوں کو پیش کیا۔ بہت سی بیٹیوں کو لے کر پہنچے گا انہیں کاندھوں پر ہل رکھا جائے گا۔ اور اس فیصلے کے ساتھ سب اپنے اپنے گھر ایک ذمہ داری کا احساس لیے لوٹ گئے۔ اچانک بہت سے والدین کی بیٹیوں کے لیے نفرت محبت میں بدل گئی اور انہوں نے اپنی بیٹیوں کو آنچل میں چھُپا لیا۔
خوشی رام آدھی رات تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا، اس نے سوچا تھا کہ اس بار اگر فصل اچھی ہو گئی تو دونوں لڑکیوں کا کنیا دان کر دے گا لیکن سُوکھے نے سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا تھا اسے فصل کی تباہی کا اس قدر غم نہیں تھا جتنی اسے یہ بات ستا رہی تھی کہ اب لڑکیوں کا بیاہ کس طرح ہو گا۔ لڑکے والوں سے کئے گئے وعدہ کو کس طرح پُورا کرے گا، اس کے پاس سوائے سوکھی ہوئی زمین کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ زمین سے پیدا ہونے والی ہریالی پر اس کی زندگی اور زندگی کے منصوبوں کا دارومدار تھا۔ بارش کے نہ ہونے سے صرف زمینوں کی ہریالی ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کی زندگی ہریالی سے محروم ہو گئی تھی سب کچھ ختم سا ہو رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ سوال گردش کر رہا تھا کہ کس طرح بارش کے دیوتا کو خوش کیا جائے اور یہ سوال بھی اس کے دماغ پر چھا گیا تھا کہ کیا لڑکیوں کے ہل چلانے سے بارش ہو جائے گی؟ اگر ایسا ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔ انہی خیالات کی جنگ میں کافی وقت گزر گیا۔ پھر وہ اچانک اتنی تیزی سے اٹھا جیسے بستر میں برقی لہریں دوڑ گئی ہو، وہ اُٹھ کر اس کمرے میں گیا جہاں اس کی چاروں لڑکیاں محوِ خواب تھیں۔ اس کی نگاہیں دونوں بڑی لڑکیوں کے اوپر ٹھہر گئیں جن کی شادی بارش کی منتظر تھی۔ اس نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھا ابھی سورج کے نکلنے کے وقت بہت دیر تھی۔ اس نے سوچا کہ میں اگر اسی وقت کھیتوں کی طرف رخ کروں تو سب سے پہلے پہنچ جاؤں گا اور اس خیال میں پختگی پیدا ہوتے ہی اس نے دونوں لڑکیوں کو جگایا۔ دونوں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں اس نے بڑے پیار سے کہا۔
''میری بچیو آج پَرِکشا کا سَمے ہے تمہاری پرکشا ہے۔ میری پرکشا ہے۔ آؤ چلیں ہم کھیتوں میں ہل چلائیں گے، اس میں ہم سب کی بھلائی ہے۔''
دونوں لڑکیوں نے باپ کی حسرت بھری نگاہوں میں جھانکا اور کہا۔
''آپ کی اِچھا کا پالن ہمارا کرتویہ ہے۔'' دونوں اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ خوشی رام کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ اس نے اپنی بیٹیوں کو چمٹاتے ہوئے کہا۔
''خوش رہو میری بچیو! تم نے میرے جی کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ ایشور تمہاری رکچھا کرے۔''
اور جب اس کی بیٹیاں تیار ہو گئیں تو اس نے آنگن میں رکھا ہوا ہل اپنے کاندھے پر رکھا اور باہر جانے لگا۔ کھونٹے سے بندھے ہوئے بیلوں نے اپنی گردنیں ہلائیں اور غور سے خوشی رام کو دیکھا جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ آج کیا بات ہے جو صرف ہل لے کر باہر چلے گئے۔ ہماری رسیاں نہیں کھولیں۔ دونوں بیلوں کی نگاہیں دونوں لڑکیوں پر ٹھہر گئیں۔ جیسے وہ اپنی گردنوں کا مقابلہ لڑکیوں کے نازک سے کاندھوں سے کرتے ہوں۔ لڑکیاں تقریباً دلہن سی بنی ہوئی تھیں، باپ کی خواہش کی تکمیل کے سبب ان کے چہروں پر عزم و استقلال اور بے خوفی آ گئی تھی۔ خوشی رام تیز قدموں سے کھیتوں کی طرف بڑھ رہا تھا اسے ڈر تھا کہ کوئی اور اس سے پہلے اپنی بیٹیوں کولے کر نہ پہنچ جائے۔ جب وہ اس زمین پر پہنچا جہاں ہل چلانا تھا تو اس نے دیکھا کہ وہاں اس وقت تک کوئی نہیں آیا تھا اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی اور رنج بھی۔ اس نے اپنی بیٹیوں کی طرف دیکھا وہ دونوں باپ کے حکم کی منتظر تھیں۔ تھوڑی دیر تک وہ انتظار کرتا رہا اور اسی انتظار کے وقفہ میں اس نے اندر دیوتا سے بارش کی بھیک کے ساتھ اپنی بیٹیوں کی زندگی بھی مانگی۔ اس کی آنکھوں سے غُربت کے آنسو بہنے لگے تھے۔ چہرے

پر پژمردگی چھانے لگی تھی لیکن اس کا ارادہ بدلا نہیں تھا کہ اس کی تمام اُمیدیں بارش سے وابستہ تھیں۔
سورج ابھی نکلا نہیں تھا تماشائی ایک ایک کر کے آنے لگے تھے لیکن کسی کے ساتھ بیٹیاں نہیں تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں مجمع اکٹھا ہو گیا۔ پنڈتوں اور گاؤں کے بزرگوں نے رسمی کاروائی شروع کی اور پھر اس آشا کے ساتھ کہ ان دونوں کنیاؤں کے کاندھوں پر ہل رکھ دیا کہ ان نازک اندام کی محنت کشی دیکھ کر آسمان ضرور برسے گا۔ لڑکیوں نے چلنا شروع کیا۔ بے آب زمین پتھر ہو چکی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہل چٹانوں میں چلایا جا رہا ہے۔ لیکن وہ لڑکیاں کھینچتی رہیں۔ بہت دیر تک، سُورج پُوری آب و تاب کے ساتھ نکل آیا تھا۔ تماشائیوں کے جسم اس کی آنچ سے تپنے لگے تھے اور پسینے کی بارش ان کے بدن سے ہونے لگی تھی لیکن آسمان پر بادل نہیں آیا۔ ہر شخص آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا سوائے مایوسی کے کچھ نہ تھا۔
لڑکیاں مسلسل اپنی کمزور طاقت سے زمین کا سینہ چیرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اُن کے کاندھوں پر خون کے قطرے اُبھر نے لگے تھے ٹانگیں لرزنے لگی تھیں۔ جسم کا پسینہ بہتے بہتے خشک ہو گیا تھا۔ لیکن اب رُکنا نا ممکن تھا کہ آج دیوتا کی بے رحمی اور شقی القلبی کو دیکھنا تھا۔ آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا لیکن بارش کے کوئی آثار نمایاں نہیں ہوئے۔ لوگوں کی گردنیں آسمان کی طرف دیکھتے دیکھتے دکھنے لگی تھیں۔ خوش رام اپنی بیٹیوں کے نڈھال جسم کو دیکھ کر خود بھی نڈھال ہو گیا تھا لیکن اپنے فیصلے کو بدل نہیں سکتا تھا کہ اُمیدیں ابھی ٹوٹی نہیں تھیں۔ یہی سبب تھا کہ کوئی شخص اپنی جگہ سے ہٹ کر واپس نہیں گیا تھا اب تماشائی بارش کا انتظار نہیں کر رہے تھے بلکہ کنیاؤں کا انجام دیکھنے لیے ٹھہرے ہوئے تھے۔ بہت دیر کی مایوسی کے بعد بزرگوں نے مشورہ کیا کہ ایسا نہ ہو کہ کنیائیں زندگی سے محروم ہو جائیں۔ اگر جان کا خطرہ ہو تو اس کوشش کو یہیں ختم کر دیا جائے۔ سب نے خوشی رام سے مشورہ کیا، اس کے عزائم سوکھی زمین کی طرح پتھریلے تھے۔
میری بیٹیاں ایسی نہیں جوے دھ کے میدان سے بھاگ جائیں یا اگنی پرکشا سے ڈر جائیں۔ آج دیوتا کو اپنا فیصلہ بدلنا ہو گا۔ آج بارش ضرور ہو گی۔
اور پھر عجیب اتفاق ہوا کہ اچانک اندھیرا چھا گیا۔ پورا آسمان کالی گھٹاؤں سے گھر گیا۔ سارے گاؤں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ خوشی رام کے مرجھائے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اپنی بیٹیوں کی عزت اس کے دل میں بڑھ گئی۔ تمام تماشائی ان کی جے جے کار کرنے لگے کنیائیں ابھی اپنے ٹوٹے ہوئے بدن سے ہل کھینچ رہی تھیں اور انہیں اس وقت تک کھینچنا تھا جب تک کہ بارش کا پہلا قطرہ کھیت کی بے آبی کو سیراب نہ کرے۔ ان کے جسم بالکل بے جان ہو گئے تھے، کاندھوں سے بہتا ہوا خون کپڑوں پر آ کر جم گیا تھا لیکن آسمان پر چھائے بادلوں نے اور قوّت بھر دی تھی۔
اور جب بجلی چمکی، بادل گرجے اور آسمان نے اپنے فواروں کو کھولا تو تمام تماشائی چلّا اٹھے، خوشی کی یہ چیخیں پوری فضا میں پھیل گئیں۔ سبھی لوگ خوشی سے چلاتے ہوئے اپنی بارش کی دیویوں کی طرف بڑھے جو بارش کے پانی کے زمین تک پہنچتے ہی گر پڑی تھیں اور ان کے جسم پانی میں نہا گئے تھے اور جب لوگوں نے انہیں اٹھایا اور یہ محسوس کیا کہ ان کی سانسوں کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے تو چیختے ہوئے مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ سب نے خوشی رام کے چہرے کو دیکھا، اُس کے چہرہ پر بہت اطمینان تھا جیسے اس نے پہلی ہی بارش میں اپنی دیوی جیسی بیٹیوں کو ڈولی میں بٹھا کر رُخصت کر دیا ہو۔
***

مجرم کون؟

ٹیلی فون کی گھنٹی ایک بار پھر بجی۔
’’ہیلو۔۔۔جی۔۔۔وہ ایسا ہے ہمیں آپ کی منجھلی والی لڑکی پسند ہے آپ کہیں تو ہم عید بعد آ جائیں۔‘‘
چچی بی نے ٹیلی فون رکھ دیا۔
’’جی ۔۔۔ہیلو۔۔۔میں لکھنؤ سے بول رہی ہوں ۔۔۔ہمارے یہاں سب کو آپ کی منجھلی بیٹی بہت پسند آئی۔ آپ کہیں تو .....‘‘
چچّی بی نے فون کاٹتے ہوئے کہا:
’’لیکن ہمارے یہاں آپ کے بیٹے کو کسی نے پسند نہیں کیا۔‘‘
ٹیلی فون کی گھنٹیاں بجتی رہیں اور چچی بی اسی طرح جھنجھلا کر ریسور پٹختی رہیں۔ یہ بات سنتے سنتے انہیں اُلجھن سی ہونے لگی تھی اور اُنہیں ڈر تھا کہ کہیں یہ اُلجھن نفرت میں تبدیل نہ ہو جائے اور اس کا الزام وہ خود پر نہیں خدا پر لگاتی تھیں کہ وہی سب کا خالق ہے۔ فرق تو اُسی نے پیدا کیا ہے۔ کیوں اس نے سب کو ایک جیسا نہیں بنایا۔ ایک ہی درخت پر اچھّے بُرے

پھل لگا دیے، اگر آدمی کے اختیار میں ہوتا تو دنیا میں صرف خوبصورت آدمی پیدا ہوتے۔ کون باغبان چاہتا ہے کہ اس کے گلشن میں کوئی بد وضع پھول کھلے۔ یہ سب کچھ سوچنے کے بعد وہ استغفار پڑھتیں اور کہتیں ’’خدا غیب کا حال جانتا ہے معلوم نہیں اس میں کیا مصلحت ہے ورنہ وہ بھی تو اس دنیا کا باغبان ہے اور وہ بھی اپنے گلشن کو حسین دیکھنا چاہتا ہو گا۔ ذہنی کرب انسان کو سب کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اسے اپنے وجود سے بھی نفرت ہونے لگتی ہے۔ چچی بی بھی ذہنی کرب میں مبتلا تھیں۔ بیٹیوں کی بڑھتی ہوئی عمر ہی والدین کے کرب کا سبب بن جاتی ہے۔ وہ چار بیٹیوں کی ماں تھیں۔ لوگ ان کے روبرو روایت بیان کرتے کہ خدا اس کے لیے جنت کے دروازے کھول دیتا ہے جو چار بیٹیوں کی پرورش کرتا ہے، وہ کہتیں شاید اس لیے کہ زندگی میں جہنم کی سزا پا لیتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ انہوں نے اپنی دنیاوی جنت کو بالائے طاق رکھ کر اپنی چاروں بیٹیوں کی پرورش کی تھی۔ انہوں نے اپنی بیٹیوں کے سر پر دھوپ نہیں آنے دی تھی۔ وہ مستقل ان کا سائبان بنی ہوتی تھیں۔ انہیں چاروں بٹیاں عزیز تھیں کہ وہ انہیں کا ہی تو حصہ تھیں۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ بڑی بیٹی کو بہت چاہتی تھیں۔ شاید اس لیے کہ سب سے پہلے اسی نے انہیں ماں کہہ کر پکارا تھا۔ انہیں ماں کا اعزاز بخشنے والی وہی بیٹی تھی۔ اس کے بدلے میں چچی بی نے بھی اپنے وجود کو بھول کر اس کی پرورش کی تھی۔ اپنا عیش و آرام سب کچھ اس پر قربان کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنی دانست میں اسے اچھی تعلیم دلوائی تھی ہروہ کام جو وہ خود جانتی تھیں اسے سکھایا تھا کبھی کبھی ماں کی اس خاص توجہ کے سبب چھوٹی بہنیں جلن بھی محسوس کرنے لگتی تھیں۔ پھر ماں کے سمجھانے پر سب کچھ بھول جاتیں۔

جب ان کی بیٹیوں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو ان کے گھر بسانے کی فکر نے راتوں کی نیند کو اڑا دیا۔ وقت اتنی تیزی سے گزرا کہ پتہ ہی نہیں چلا کہ کب چاروں بیٹیاں جوان ہو گئیں۔ چچی بی اپنی سب سے بڑی بیٹی کے لیے متفکر تھیں۔ وہ جلد از جلد اس فکر سے آزاد ہونا چاہتی تھیں۔ بڑی بیٹی ایم اے پاس کر چکی تھی اور چھوٹی بیٹی بی اے کی طالبہ تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ تمہاری منجھلی بیٹی بہت حسین ہے۔ وہ بھی اس بات کو جانتی تھیں لیکن اس کا اظہار نہیں کرتی تھیں۔ اس لیے کہ انہیں بڑی بیٹی کی خوشیاں عزیز تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کو سب سے پہلے ماں کہنے والی بیٹی رنجیدہ ہو اور پھر ماں کے لیے تو سب بچے ہی حسین ہوتے ہیں۔ لیکن منجھلی کے حسن سے وہ پریشان رہنے لگی تھیں اس لیے کہ وہ حسن بڑی کے گھر بسانے میں رکاوٹ بن رہا تھا۔

چچی بی کا خاندان بہت بڑا تھا اور ان کے تعلقات کا حلقہ بھی وسیع تھا۔ اس لیے بیٹیوں کے جوان ہوتے ہی رشتے آنے لگے تھے۔ یوں تو چچی بی کی چار بیٹیاں اچھی صورت شکل کی تھیں لیکن سب سے بڑی چھوٹی بہنوں کی طرح حسین نہیں تھی جب کہ وہ سب سے زیادہ سلیقہ مند تھی کیوں کہ چچی بی نے سب سے زیادہ توجہ ہی اس پر دی تھی۔ لیکن آنکھوں کے اس بازار میں ظاہری حسن کو ہی فوقیت حاصل ہے۔ آدمی جو دیکھتا ہے بس وہی دیکھنا چاہتا ہے جو اسے دکھائی نہیں دیتا، اسے دیکھنا نہیں چاہتا جب کہ حقیقت وہ ہے جو نظروں سے اوجھل ہے۔ چچی بی کو دکھ یہ تھا کہ جو کوئی بڑی کا رشتہ لے کر آتا۔ منجھلی کا ہاتھ مانگ کر چلا جاتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ بڑی عمر اور چچی بی کی فکر بڑھتی جا رہی تھی۔ انہیں افسوس یہ تھا کہ جس پھول پر انہوں نے سب سے زیادہ محنت کی تھی اس کا کوئی طلب گار نہیں تھا۔ انہیں اپنی بڑی بیٹی کے جذبات کا احساس تھا وہ اس کے روبرو کبھی ملول نہ ہوتی تھیں۔ جب کہ اندر ہی وہ گھلتی جا رہی تھیں۔ انہوں نے ہر ایک سے صاف انکار کر دیا تھا کہ منجھلی کی شادی اس وقت تک نہیں ہو گی جب تک بڑی رخصت نہیں ہو جاتی۔ اسی لیے چچی بی نے اکثر یہ بھی کیا کہ جب کوئی رشتہ کے ارادے سے آیا تو انہوں نے منجھلی کو گھر سے باہر کہیں بھیج دیا تاکہ اس پر کسی کی نظر ہی نہ پڑے۔ لیکن یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ اب چچی بی کی فکر اور الجھن نفرت میں بدلنے سی لگی تھی۔ وہ منجھلی کی شکل سے چڑنے لگیں تھیں کہ انہیں بڑی کی خوشی اور جذبات کا احساس تھا۔

پھر ایک دن انہوں نے انتہائی کشمکش کے عالم میں وہ فیصلہ کر لیا جو مائیں نہیں کرتیں۔ رات کے اندھیرے میں وہ ایک گلاس تیزاب لے کر منجھلی کے کمرے کی طرف بڑھیں۔ دروازہ کھلا تو تھا۔ چچی بی کمرے کے اندر داخل ہوئے۔ منجھلی بے خبر سو رہی تھی۔ نائٹ بلب کی مدھم سی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ چہرے کے اتار چڑھاؤ سے لگتا تھا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ چچی بی نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔ چہرہ چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ ماں کی محبت امڈ آئی لیکن بڑی بیٹی کی خوشیوں کی فکر نے اُسے دبا دیا۔ تیزاب کا گلاس لے کر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھیں۔ اسی لمحہ منجھلی خواب میں بڑبڑائی۔ ’’امّی ـــــامّی ـــمجھے بچاؤ۔ کوئی میرے اوپر تیزاب ڈال رہا ہے۔‘‘

چچی بی کے ہاتھوں سے تیزاب کا گلاس چھوٹ گیا۔ زمین پر پھیلے ہوئے تیزاب نے ان کے اپنے ہی پیروں کو جلا دیا۔

***

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی

چاروں لڑکیاں اگرچہ جوانی کی دہلیز پر دستک دینے لگی تھیں لیکن کہانیاں سننے کا وہ شوق جو دادی ماں نے بچپن میں کہانیاں سنا سنا کر پیدا کر دیا تھا آج بھی ان کے دلوں میں موجود تھا۔ دادی ماں کی کہانیاں بچوں کو اس لیے پسند آتی ہیں کہ ان میں حیرت و استعجاب سے بھر پور ایک اجنبی دنیا ہوتی ہے۔ ایسی کہانیاں جو تخیّلات کے مرکب پر سوار ہو کر وادیِ طلسمات کے اوپر سے پرواز کرتی ہیں۔ آج بھی چاروں دادی ماں کو گھیرے میں لیے انتہائی انہماک کے ساتھ کہانی سن رہی تھیں۔ دادی ماں اپنے قدیم لیکن پُر اثر انداز میں کہہ رہی تھیں کہ ’’اس بادشاہ کی حکومت میں ایک جزیرہ تھا کہ جس کا نام جنت نظیر تھا۔
اونچے اونچے پہاڑوں سے گھرا ہوا وہ جزیرہ زمین پر اتری ہوئی جنّت کہا جاتا تھا ہرے بھرے اور برفیلے پہاڑ اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتے تھے لیکن اس جزیرے میں ایک دیو داخل ہو گیا تھا جس نے وہاں کی خوبصورتی کو داغدار کر دیا تھا۔ دیو کے خونی حملوں سے ہر شخص خود کو غیر محفوظ سمجھتا تھا۔ بادشاہ اس آفتِ ناگہانی سے پریشان تھا۔ اس انتشار کی وجہ سے لوگوں نے اس کا نام خونی جزیرہ رکھ دیا تھا اور کوئی شخص اس خونی جزیرے میں جانے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا لیکن بادشاہ کے حکم کی عدولی ممکن نہیں تھی اس لیے لاچار و بے بس فرض کو ادا کرنے کے لیے بے بس تھا ......‘‘
دادی ماں کی یہ کہانی برابر کے کمرے میں لیٹا ہوا یوسف بڑے غور سے سن رہا تھا۔ دادی ماں بیان کر رہی تھیں کہ بادشاہ نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ جو کوئی شخص فرض کی ادائیگی کے وقت دیو کے ہاتھوں جان گنوا دے گا حکومت اس کے خاندان والوں کے تمام اخراجات کے لیے زر کثیر دے گی۔ کچھ لوگ مجبوراً اور کچھ لوگ ضرورتاً خونی جزیرے میں کام کرنے جانے لگے تھے۔‘‘
دادی ماں کی یہ بات سن کر یوسف سوچنے لگا کہ ضرورتاً تو وہ بھی وادی میں جا سکتا ہے۔ اس کی ضرورت تو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ اس کی نظروں کے سامنے چاروں جوان ہوتی ہوئی بیٹیوں کا مستقبل گھومنے لگا۔ بہت غور و خوض کے بعد اس نے پاس لیٹی بیوی سے کہا۔
’’زینب تمہیں معلوم ہے ہمارے دفتر کے بڑے بابو کا دو ماہ قبل ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔‘‘
زینب کہ جس کی پلکوں کو نیند چھونے لگی تھی عالم غفلت میں بولی۔
’’یہ بے وقت بڑے بابو کہاں سے یاد آ گئے۔ وہ تو مجھے معلوم ہے۔ اب کیا ہوا؟‘‘
زینب کے لہجہ میں جھنجھلاہٹ سی تھی اور یوسف بہت آہستگی سے کہہ رہا تھا۔
’’نہیں ہوا کچھ نہیں۔ یونہی سوچ رہا تھا کہ اس کی بیوی بچوں کو ان کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہو گی۔‘‘
’’ہاں تھوڑے بہت دن یاد رکھتے ہیں، پھر سب بھول جاتے ہیں۔ آج مرا کل دوسرا دن‘‘
زینب نے اتنا کہہ کر دوسری طرف کروٹ بدلی۔ یوسف نائٹ بلب کے دھندلکے میں دیوار پر چپکی ہوئی اس چھپکلی کو دیکھ رہا تھا جو ہر وار میں ایک کیڑے کو نگل جاتی تھی۔ دادی ماں ابھی تک خونی جزیرے کی کہانی بیان کر رہی تھیں۔ یوسف نے پھر زینب کی غنودگی پر حملہ کیا۔
’’زینو تمہیں یاد ہے کہ ماموں جان کا انتقال کیسے آناً فاناً ہوا تھا ہارٹ فیل ہو جانے سے۔‘‘
زینب نے قدرے اکتاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے یوسف کی جانب کروٹ لی اور کہا۔
’’آج آپ مجھے سونے دیں گے یا مرحومین کی یاد کراتے رہیں گے۔‘‘
’’نہیں ...... میں سوچ رہا تھا کہ ان کے جوان جوان بچے تھے اچانک انتقال سے پریشان ہو گئے۔‘‘ یوسف کچھ لڑکھڑاتا ہوا بولا۔
زینب کچھ تیز لہجہ میں کہنے لگی۔
’’پریشانی کیا خاک ہوئی؟ اولاد کے مزے آ گئے۔ دفتر سے کئی لاکھ روپے مل گئے۔ تین لاکھ بیمہ کے ملے۔ سال بھر کے اندر سب کی شادیاں ہو گئیں۔ باپ کی برسی کا بھی انتظار نہیں کیا۔‘‘
’’کیوں بھئی روپوں کی ضرورت تو ہمیں بھی ہے۔ ہماری چاروں بیٹیاں دادی کے لائق ہو گئی ہیں۔ ماموں جان کی طرح اگر اچانک روپیہ مل جائے تو ......‘‘
’’تمہارے منہ میں خاک ..... لعنت ایسے پیسے پے .... کیا بے وقت الٹی سیدھی باتیں کرنے بیٹھ گئے۔‘‘ زینب کے لہجہ میں ناراضگی اور محبت شامل تھی۔ اس کی نیند اب اڑ چکی تھی اس کی محبت یوسف کے دل میں اتر گئی۔ اس نے آہستگی سے کہا۔
’’دیکھو بات در اصل یہ ہے کہ ہمارے دفتر سے کئی لوگ وادی میں کچھ سرکاری کام کے لیے بھیجے جا رہے ہیں۔ اس میں

میرا نام بھی ہو سکتا ہے اور تمہیں تو معلوم ہے کہ وہاں بد امنی پھیلی ہوئی ہے۔ وہاں جان کا خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔''
''تو کیا آپ وہاں جائیں گے؟'' زینب نے فوراً سوال کیا۔
''اس میں برائی کیا ہے۔ ہم تو سرکاری ملازم ہیں۔ سرکار ہمیں کہیں بھی بھیج سکتی ہے''
یوسف نے زینب کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔
''لیکن جانتے بوجھتے کون خود کو بھاڑ میں جھونکے گا۔''
''اس میں بھاڑ میں جھونکنے والی کیا بات ہے۔ موت تو کہیں بھی آ سکتی ہے۔ اور پھر میں اکیلا تو جا نہیں رہا بیسیوں لوگ جا رہے ہیں۔ حکومت تو جانے والوں کے لیے بہت آسائشیں فراہم کر رہی ہے۔ سفر و قیام کے علاوہ زائد تنخواہ ملے گی۔ ہر آدمی کی بیمہ کرایا جائے گا۔ خدا نخواستہ اگر کوئی حادثہ ہو جائے تو بیمہ کی رقم کے علاوہ پسماندگان کو تا حیات اخراجات ملتے رہیں گے۔'' یوسف کی باتوں سے زینب ایک انجانے خوف سے سہمنے سی لگی اور اپنی تمام تر محبت کا اظہار کر تے ہوئے کہنے لگی۔
''اب رات بہت ہو چکی ہے سو جائیے۔ اماں کی کہانی بھی ختم ہو گئی۔'' وہ سوچنے لگا کہ کہانی تو کبھی ختم ہی نہیں ہوتی۔ ہر کہانی کا اختتام نئی کہانی چھوڑ جاتا ہے۔ اصل کہانیاں تو دلوں میں بنتی ہیں۔ اس کا دل و دماغ بھی ایک کہانی بننے لگا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آدمی محنت کیوں کرتا ہے؟ خوشحال زندگی گزارنے کے لیے۔ اپنے بیوی اور بچوں کے خوشگوار مستقبل کے لیے۔ اور میں اگر اس سفر کو اختیار کرتا ہوں تو ہو سکتا ہے میری بچیوں کا مستقبل تابناک ہو جائے۔ موت سے ڈر کر آدمی کب تک بھاگ سکتا ہے۔ موت کے لیے وقت اور مقام کی قید نہیں ہوتی۔ وہ بہت دیر تک نفع اور نقصان کے پلڑوں کو اوپر نیچے ہوتے دیکھتا رہا۔ مالی نفع ہر حال میں تھا اور وہ جانتا تھا کہ آج کی مادی زندگی میں مالی نفع ہر حال میں تھا اور وہ جانتا تھا کہ آج کی مادی زندگی میں مالی نفع رشتوں اور جذبوں سے بالا تر ہے۔ مالی سکون زخموں کو بھر دیتا ہے اور غموں کو دھو ڈالتا ہے۔ سوچتے سوچتے یوسف نے فیصلہ کر لیا تھا وہ اس موقع کو ضائع نہیں کرے گا کہ اس سے بہتر موقع شاید دوبارہ حاصل نہ ہو۔ زینب اور چاروں لڑکیاں سو چکی تھیں اسے محسوس ہوا جیسے اس کے فیصلے کے بعد ان سب کو اطمینان و سکون کی نیند آ گئی .... اس کی چاروں بیٹیاں جیسے بڑی شان و شوکت کے ساتھ رخصت ہو گئیں ......
اور پھر یوسف کا وقت قریب آ گیا۔ یہ پندرہ دن کا سفر سب پر اس طرح سوار تھا جیسے یوسف کا یہ آخری سفر ہے۔ زینب اور اس کی بیٹیاں خوش نہیں تھیں کہ ابھی ان کے خون میں سرخی باقی تھی۔ یوسف کے دل و دماغ پر بھی خوف طاری تھا لیکن مسکراہٹ کا مکھوٹہ لگائے سب کو سمجھا رہا تھا اس نے زینب سے کہا تھا۔
''دیکھو اگر تم ہی ہمت ہار جاؤ گی تو بچیوں کا کیا ہو گا۔ ان عورتوں کے بارے میں سوچوں جن کے شوہر فوج میں ہیں۔ میں انشاء اللہ جلد لوٹ آؤں گا اور اگر.....''
یوسف کے گلے میں یہ بات اٹک گئی اس نے آنسوؤں کو ضبط کیا لیکن زینب آواز کے درد کو محسوس کر کے رونے لگی۔
یوسف نے اسے سینے سے لگا کر دلاسا دیا اور کہا ''تم کو ہی سب کا خیال رکھنا ہے۔'' یوسف اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔
رخصت کے وقت اپنی بوڑھی ماں کی دعائیں لینے کے لیے اس کے پاس گیا۔ ماں کی ممتا نے زندگی کی سیکڑوں دعائیں اس کے دامن میں ڈال دیں۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا بیٹا خونی جزیرے کی سمت جا رہا ہے۔ جہاں کوہ قامت دیو منہ کھولے کھڑا ہے۔ پھر سب نے دلوں پر چٹانیں رکھ کر یوسف کو رخصت کر دیا۔
سب کچھ ٹھہر سا گیا تھا گھر وہی تھا، افراد وہی تھے لیکن ایک فرد نہیں تھا ایسا لگتا تھا کہ وقت بہت دھیمی رفتار سے چل رہا ہے۔ پندرہ دن پندرہ برس ہو گئے ہیں۔ سب یوسف کے بن باس سے لوٹنے کے منتظر تھے۔ زینب کے لیے ان دنوں کی خبریں اہم ہو گئی تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ ہر لمحہ اسے وادی کی خبریں۔ وہ ہر روز اخبار میں وادی میں مرنے والوں کے نام کئی کئی بار دیکھتی تھی۔ ادھر یوسف کو ہر وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ موت کے فرشتے اس کے چاروں طرف منڈلا رہے ہیں اور اسے دبوچنے والے ہیں۔ بم دھماکے میں اسے موت کی آہٹ سنائی دیتی تھی۔ وہ زینب کے پاس روپیوں کے ڈھیر دیکھ رہا تھا اور اپنی بیٹیوں کو آنکھوں ہی آنکھوں میں رخصت کر رہا تھا۔
وقت گذرنے لگا ایک دن...... دوسرا دن......تیسرا دن........ پندرہ دن بیت گئے۔ پندرہویں دن اسے واپس جانا تھا ...... زینب کے پندرہ برس گذر گئے لیکن خوف کی تلوار اب بھی اس کے سر پر لٹکی ہوئی تھی۔ وادی سے لوٹنے والوں کے تمام اعزاء ایئر پورٹ پر موجود تھے۔ جس وقت جہاز آہستہ آہستہ زمین پر اترا تو لوگوں کو اپنے دل کی دھڑکنیں رکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ سب کی نگاہیں اپنے مسافروں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ زینب اور اس کی چاروں بیٹیاں بے چین تھیں کہ یوسف ابھی تک ایئر پورٹ سے باہر نہیں آیا تھا، بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ باہر آتی ہوئی ایک دو میّتوں کو دیکھ کر ان کے دل سہم گئے تھے۔ ایئر پورٹ پر خوشی و غم کا ملاجلا ماحول تھا اور پھر مایوسی اور نامیدی کے دھند لکے میں یوسف کا چہرہ نظر آیا۔ زینب اور اس کی چاروں بیٹیاں کھِل اُٹھیں وہ اس کی جانب بے اختیار دوڑ پڑیں۔ یوسف نے زینب کے چہرے کو دیکھا اس نے محسوس کیا کہ

خوشی اور اطمینان کے سبب اس کا چہرہ سرخ ہو گیا ہے، آنکھیں چھلک گئی ہیں۔ محبت کے اس اظہار سے یوسف خوش ہوا لیکن بیٹیوں کے چہروں کی خوشی دیکھ کر افسر دہ ہوا کہ ان کی پُر شکوہ رخصت کا سبب نہ بن سکا۔

***

کینسر وارڈ

''کینسر مجھے نہیں ہے میرے بیٹے کو ہے۔''

تنہائی اور زندگی کے کرب کی حالت میں مجھے ماں کا یہ جملہ یاد آ گیا ہے مجھے یاد ہے میری ماں نے اپنی بیماری اور میری زندگی کا موازنہ کرنے کے بعد ایسا کہا تھا۔ مجھے سب کچھ یاد ہے۔ قطرہ قطرہ یادیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں ....

میں دفتر سے لوٹ آیا ہوں۔ ہر روز صبح میں دفتر کے لیے روانہ ہوتا ہوں اور شام کو لوٹ آتا ہوں۔ زندگی کا ایک نام دفتر ہے۔ جب آدمی کا شعور بالغ ہو جاتا ہے تو وہ دفتر جانے لگا ہے اور جب اس کا ذہن بوڑھا ہو جاتا ہے تو اسے دفتر سے علاحدہ کر دیتے ہیں اور زندگی صرف اس وقت تک ہے جب تک آدمی بوڑھا نہیں ہوتا۔ گھر پہنچ کر سب سے پہلے میں اپنی ڈاک دیکھتا ہوں۔ سرکار روٹی کپڑا مہیّا کرے نہ کرے لیکن یہ کام بہت اچھا کرتی ہے کہ خطوں کے ذریعہ اپنوں کو قریب کر دیتی ہے۔

میں خط دیکھنے لگا ہوں۔ میرے باپ کی تحریر ہے۔ تمہاری ماں بیمار ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ اس کا مرض کینسر کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔ بہت جلد وہ تمہارے پاس پہنچے گی۔

کینسر؟

یہ لفظ پڑھ کر میری حرکتِ قلب بڑھ گئی ہے نگاہیں اُس لفظ پر ٹھہر گئی ہیں۔ کینسر تو موت کا دوسرا نام ہے۔ یہ ماں کو نہیں ہونا چاہیے۔ ماں نہیں ہو گی تو ممتا کے بغیر اولاد کیسے رہے گی۔

میری ماں میرے پاس آ گئی ہے میں اس کا چہرہ دیکھ کر ڈر گیا ہوں۔ زندگی سے مایوسی کا احساس چہرہ کو کتنا مظلوم بنا دیتا ہے۔ میری آنکھیں رونے لگتی ہیں وہ مجھ سے لپٹ کر رونے لگتی ہے۔ اس کے آنسو دیکھ کر اچانک میں اس سے بڑا ہو گیا ہوں اور اسے سمجھاتا ہوں۔ پیار کرتا ہوں۔ جیسے وہ سمجھاتی تھی، پیار کرتی تھی۔ ''تم روتی کیوں ہو ماں۔ تم اچھی ہو جاؤ گی۔ میں تمہارا علاج کراؤں گا۔''

میں دفتر سے چھٹی لے لیتا ہوں۔ دفتر ماں سے اہم نہیں ہے۔ پھر مریضوں کی لائن میں لگ گیا ہوں ....لائن جو بہت طویل ہے ....اور جس کا ہر فرد کینسر میں مبتلا ہے ..... چپراسی مریضوں کے نام پکار رہا ہے۔ کینسر کے جن مریضوں کی فہرست چپراسی کے پاس ہے۔ وہی ملک الموت کے پاس بھی ہے۔ پہلے چپراسی پکارتا ہے اور پھر ملک الموت۔ اور ان دونوں کے درمیانی وقفہ میں مریض ہر ایک سے زندگی کی بھیک مانگتا ہے۔ اپنی بچی ہوئی خوشیوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہسپتال کی ایک بینچ پر میری ماں میرے قریب بیٹھی ہے۔ اور منتظر ہے کہ کب ڈاکٹر کے کمرے پر کھڑا چپراسی اس کا نام پکارے۔ اس کا چہرہ کتنا ویران ہو گیا ہے۔ وہ بار بار محبت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتی ہے جیسے اپنی آنکھوں میں مجھے اتار لینا چاہتی ہو۔ میں اس کی بے پناہ ممتا کی تاب نہ لا کر رونا چاہتا ہوں لیکن ضبط کرتا ہوں کہ میری ماں کا دل بہت کمزور ہے۔ چپراسی پکار رہا ہے۔

گیان چند.......

بینچ پر بیٹھا ہوا ایک جسم حرکت کرتا ہے۔ اس کے گلے میں نلکیاں لگی ہوئی ہیں۔ وہ بول نہیں سکتا ہے۔ کینسر نے اس کی قوت گویائی چھین لی ہے۔

شکنتلا ..... چپراسی کی آواز گونجتی ہے۔

کتنی خوبصورت عورت ہے اور کتنی کم عمر ...... لیکن چہرے پر ویرانی ہے بالکل ایسی ہی جو میری ماں کے چہرے پر ہے ..... میری ماں عمر کے ساٹھ سال گذار چکی ہے لیکن اس نے تو ابھی کچھ نہیں دیکھا۔ کینسر عمر کیوں نہیں دیکھتا ..... ریٹائر منٹ سے پہلے کی عمر کینسر کے لیے نہیں ہوتی ......

میں اٹھ کر ٹہلنے لگتا ہوں ...... ہسپتال کتنے مریضوں سے بھرا ہوا ہے اور ان سب کو کینسر ہے ..... معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا بیمار ہو گئی ہے ....میں سوچنے لگا ہوں بیمار کیوں ہوتے ہیں۔ موت سے ہم کنار ہونے کے لیے ...... لیکن موت بیماری کے

بغیر بھی تو آ سکتی ہے خدا ایسا کیوں نہیں کرتا ....وہ تو ہر بات پر قادر ہے ... پیدائش اور موت ..... درمیانی عرصہ خوشگوار کیوں نہیں گذرتا ...... سب سے بڑا غریب...... اور رحم و کرم کا مستحق وہ ہے جو بیمار ہے۔
چپراسی کی آواز پھر بلند ہوئی۔
فخر الزماں۔
اسٹریچر پر پڑے ہوئے بے حس و حرکت نحیف سے شخص کو لے کر چند لوگ آگے بڑھے ..... زندگی اس وقت تک اچھی لگتی ہے جب تک اپنے قدموں پر چلے ...میری ماں اسٹریچر پر جاتے ہوئے مریض کو دیکھ رہی ہے اور میرا دل اس کی آنکھوں میں بیماری کے مستقبل کا خوف دیکھ کر رو رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی آنکھیں دم توڑتے ہوئے مریضوں کونہ دیکھیں۔ ایسے منظر دیکھ کر بیمار کا مرض بڑھ جاتا ہے۔ زندہ رہنے کے لیے زندہ لوگوں میں رہنا ضروری ہے .... میری ماں کا نام پکارا جاتا ہے۔ میں اسے لے کر ڈاکٹر کے کمرے کی طرف بڑھتا ہوں۔ ڈاکٹر کی زندگی بھی عجیب ہے۔ ہر مریض کو شفقت و محبت سے دیکھتا ہے اس کے گندے جسم کو چھوتا ہے۔ زخموں کو دھوتا ہے میں نے ڈاکٹر سے کہہ دیا ہے کہ وہ ماں پر اس بات کو ظاہر نہ ہونے دے کہ اسے کینسر ہے ......کینسر کا نام مریض کو موت کے قریب کر دیتا ہے ...... لیکن میری ماں اتنی نا سمجھ نہیں ہے۔ وہ سب جانتی ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کی بیماری کو اس سے پوشیدہ رکھا جا رہا ہے۔ ہم سب حقیقت کو چھُپاتے ہیں۔ میں بھی تو اپنے اندر کے دکھوں کو چھپا کر چہرہ پر مسکراہٹ کا مکھوٹے لگائے سب سے ملتا ہوں ...... ڈاکٹر اُمید کی کرنیں روشن کرتا ہے۔ یہ اس کا فرض ہے۔
پھر ہر روز صبح اٹھتے ہی میں ماں کو لے کر ہسپتال جاتا ہوں۔ اور مریضوں کی لائن میں لگ جاتا ہوں۔
خون کی جانچ ..... کتنا خون میری ماں کے جسم سے نکالا جا چکا ہے۔ کیمیو تھروپی .... جب ڈاکٹر الیکشن کی نیڈل رگ میں چبھوتا ہے تو ماں درد سے کراہ اٹھتی ہے۔ میں اس کی تکلیف دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔
ریڈیو تھروپی ..... دیو قامت مشینوں کے بیچ جب ماں کو لٹایا جاتا ہے تو وہ ڈر جاتی ہے۔ لیکن زندہ رہنے کی خواہش خوف پر غالب آتی ہے ....
ہسپتال گھر سا لگنے لگا ہے۔ ڈاکٹر، نرس، کلرک، چپراسی گھر کے افراد سے لگتے ہیں ..... ہر روز وہی مریض ...... سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں .... بہت قریب سے .... گیان چند .... بہت بڑا تاجر ہے ..... بیٹے تجارت میں پھنسے ہوئے ہیں۔ گھر میں بہوؤں کی عملداری ہے ..... اس کی اکلوتی بیٹی اسے ہسپتال لے کر آتی ہے۔ وہ بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہے۔ شکنتلا ..... شادی کو صرف دو سال ہوئے ہیں .... ایک لڑکا ہے ..... معصوم لڑکے کے لیے ماں کی زندگی کتنی ضروری ہے .....
فخر الزماں ..... غریب ہے بوڑھا ہے ...... لیکن اولاد کی خواہش ہے کہ وہ ابھی زندہ رہے .....
اور میری ماں .... وہ زندہ رہنا چاہتی ہے۔ اس لیے کے اُسے میری بہن کو رُخصت کرنا ہے۔ اور میری بہو کو گھر لانا ہے ..... ماں کتنی عظیم ہے۔ اولاد کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھتی ہے۔ بیمار ہے .... چلنے پھر نے سے مجبور ہے لیکن ایسی حالت میں بھی اس نے میرے لیے لڑکی پسند کر لی ہے ..... وہ میری خوشی میں شریک ہونے کے لیے اپنی تکلیف کو بھول رہی ہے۔
ایک سال بیت گیا ہے ..... میں ہر روز ماں کے ساتھ ہسپتال جا رہا ہوں ...... ہسپتال جانا میری عادت سی بن گئی ہے ..... لیکن مرض بڑھتا جا رہا ہے ...... امیدیں ٹوٹتی جا رہی ہیں۔
اور پھر میں اکیلا رہ گیا ہوں .... میری ماں مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ میرا باپ تنہا رہ گیا ہے۔ اس کا گھر اجڑ گیا ہے۔ میری بہن کی ڈولی گھر سے صحن میں رکھی رہ گئی ہے۔ میری بارات چڑھنے سے قبل ہی رک گئی ہے۔ میرا چھوٹا بھائی ماں کی ممتا کو یاد کر کے رو رہا ہے اور میں اسے سمجھا رہا ہوں کہ میں بڑا ہوں مجھے ماں کی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ بیماری کے دوران ماں اسے گلے لگا کر بہت روئی تھی اور کہا تھا ”بیٹے میں تیرے لیے کچھ نہ کر سکی۔ دعا کر کہ تیری خوشیاں دیکھنے کے لیے زندہ ہوں۔“ سب کچھ ٹھہر سا گیا ہے۔ اس لیے کہ ماں نہیں ہے۔ میرے گھر کا نام ماں تھا۔ اور اب گھر کا تصوّر ہی ختم ہو گیا ہے ..... اب صرف اینٹوں کی دیواروں کا نام ماں تھا۔ اور اب گھر کا تصور ہی ختم ہو گیا ہے .... اور تنہا ئی سے گھبرا رہا ہوں۔ تمام خوشیاں ختم ہو گئی ہیں۔ زندگی سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن نہیں کر پاتا کہ رشتوں کی زنجیروں میں قید ہوں۔ اب مجھے یاد آنے لگا ہے میری ماں سچ کہہ رہی تھی:
”کینسر مجھے نہیں ہے میرے بیٹے کو ہے ..... جو دن رات میری خدمت کرتا ہے۔ میں بیمار ہو کر بھی آرام سے ہوں اور وہ صحت مند ہو کر بھی بیمار سا لگتا ہے۔ میرے جسم میں کینسر ہے جو کاٹ کر نکالا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کی زندگی کینسر بن گئی ہے، جس کی علاحدہ نا ممکن ہے۔“
سچ یہی ہے .... بیمار وہ نہیں ہے جسے بیماری نے گھیر لیا ہے ...... بیمار وہ ہے جو تیما دار ہے۔ زندگی کا ایک نام کینسر ہے

.... میری ماں اپنے دکھ سے نجات حاصل کر چکی ہے .... لیکن میں اب بھی کینسر وارڈ میں ہوں ...... چپراسی اور ملک الموت نام پکار رہے ہیں اور میں لائن میں کھڑا اپنے نام کا انتظار کر رہا ہوں۔

* * *

خواب

امراؤ بیگم نے پاندان اپنی جانب کھینچتے ہوئے یوں کہا:

''اے بی بی ابھی تک عشرت علی کی دختر کا کچھ پتہ نہیں چلا۔''

''ارے کہاں پتہ چلا، ایک مہینے سے پندرہ دن اوپر ہو گئے۔'' بلقیس جہاں نے ان کی بات کی تائید کی۔

''اے بہن کل جمعراتی سقے کی بیوی کہہ رہی تھی کہ اس لونڈیا ہی میں عیب تھا۔ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہو گی۔'' بیگم زرینہ نے اپنی نئی تحقیقی کا اظہار کیا۔

''اللہ بہتر جانے، پیٹ کی داڑھی کس نے دیکھی۔ ویسے وہ لڑکی ایسی نہ تھی۔ اللہ رکھے عشرت علی کا گھرانہ تو بڑا دین دار ہے اور لڑکیاں تو بے پردہ بار بھی نہیں نکلتیں۔'' امراؤ بیگم نے بلقیس جہاں کی طرف پان کا بیڑہ بڑھاتے ہوئے اپنی رائے دی۔

''اللہ ہر مصیبت سے محفوظ رکھے۔ جس کمبخت نے بھی لونڈیا کو غائب کیا بڑا بُرا کیا۔ بے چاری کی ماں تو روتے روتے آنکھیں پھوڑے لے رہی ہے۔''

بیگم زرینہ نے بات پوری کی تو بلقیس جہاں نے زمانے کی ناساز گاری پر ایک آہ سرد بھرتے ہوئے کہا:

''ہاں بہن، جوان لڑکی کا غائب ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آئے دن خبریں آتی ہیں کہ فلاں جگہ سے غنڈے لڑکی کو لے گئے۔ فلاں جگہ ایک لڑکی مُردہ ملی۔ یہ تو اب روز روز کی خبریں ہیں۔ آج کل تو عزّت بچانا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں دنیا کا کیا ہونے والا ہے۔''

''ویسے اب تو وہ لڑکی نہ ملے تو اچھا ہے۔ نہ ملے گی تو کچھ دن روکر صبر توکر لیا جائے گا۔ لیکن مل گئی تو عمر بھر اسے کون روئے گا۔ کون اسے اپنے گھر میں بہو بنا کر لے جائے گا۔'' امراؤ بیگم نے بڑی دور اندیشانہ بات کہی۔ بلقیس جہاں نے پھر ایک آہِ سرد بھری۔

''ہاں یہ بات تو ہے، اب کون آنکھوں دیکھے اسے قبول کرے گا۔''

بیگم زرینہ نے موضوع کا رخ بدلتے ہوئے امراؤ بیگم سے استفسار کیا۔

''ارے نور محل کی طبیعت اب کیسی ہے۔ سنا ہے کوئی ایسا ویسا خواب دیکھ کر ڈر گئی ہے۔''

''کیا بتاؤں۔ نور کی وجہ سے اور سب پریشان ہیں۔ پچھلے جمعہ کی بات ہے۔ رات کو سوتے سوتے چیخ پڑی اور اُٹھ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ زور زور سے رونے لگی۔ میں نے سمجھا کہ شاید کوئی بُرا خواب دیکھ کر ڈر گئی ہے۔ لا کھ پوچھا لیکن اس نے کچھ بتا کر ہی نہ دیا۔ اگلی رات کو پھر وہ اسی طرح چیخی اور مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔ اور نہ جانے کیوں اس کے ساتھ میں بھی ایک انجانے خوف سے ڈرنے لگی اور اب تو نور کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ ہر چیز سے ڈر نے لگی ہے، پہلے ہی اتنا کسی کے گھر نہ جاتی تھی، اب تو بالکل نکلنا ہی بند کر دیا ہے۔ کوئی گھر میں آتا ہے تو سہم کر اندر بھاگ جاتی ہے۔ ہر شکل کو مشتبہ اور سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہے۔'' اتنا کہہ کرامراؤ بیگم خاموش ہو گئیں۔

''یہ نہیں بتاتی کہ خواب میں کیا دیکھا۔'' بیگم زرینہ نے خاموشی کو ختم کیا۔

''یہی تو مشکل ہے۔'' امراؤ بیگم پھر گویا ہوئیں۔ ''خواب سے جب چیخی ہوئی پیدا ہوتی ہے تو صرف نہیں! نہیں! اس کی زبان سے نکلتا ہے۔ جیسے اس پر کوئی جبر کر رہا ہو اور وہ انکار میں چیختی ہو۔''

''کسی کو دکھانا چاہئے۔'' بلقیس جہاں نے جو اس گفتگو میں مستغرق تھیں، مشورہ دیا۔

''ڈاکٹر کو دکھایا تھا اس نے کہا ہے کہ خواب میں اتنا ڈر گئی ہے کہ اس کے دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔ اس نے دوائیں بھی دیں لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔''

''میری رائے ہے کسی بزرگ کو دکھاؤ۔ یہ معاملہ ڈاکٹروں کا نہیں۔ ضرور کسی بڑی روح کا سایہ اس پر پڑ گیا ہے، یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی دشمن نے کچھ کرا دیا ہو۔''

''وہ بھی کر کے دیکھ لیا۔ اس روز بہت دیر تک شاہ صاحب نور کے پاس رہے اور بہت سی باتیں پوچھیں لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا سرنگوں بیٹھی رہی۔ آخر شاہ صاحب نے بھی یہی کہا کہ روح وغیرہ کچھ نہیں اور نہ کسی نے کچھ کرایا ہے۔ یہ کسی خواب سے ڈر گئی ہے اور شاید مسلسل ایک ہی خواب دیکھ رہی ہے۔ انہوں نے ایک تعویذ دے دیا ہے۔ لیکن مجھے تو ابھی تک کوئی بھی فرق دکھائی نہیں دے رہا۔ خدا جانے کیا بلا میری بچی کے سر پڑ گئی ہے۔''

امراؤ بیگم نے اپنی بات پوری ہی کی تھی کہ دروازے پر ٹنگے ہوئے پردے کے پیچھے سے حاجی افتخار حسین کی تھکی ہوئی آواز اُبھری۔

''ارے بھئی ہم بھی اندر آ جائیں؟''

وہ تینوں خواتین اس آواز سے چونکنے کی حد کے قریب پہنچیں اور سروں کو دوپٹوں سے ڈھانپ لیا۔ بیگم زرینہ نے جواب دیا:

''آ جائیے بھائی صاحب کوئی غیر نہیں ہے۔''

افتخار حسین پردے کو اٹھاتے ہوئے اندر آئے اور سب کے سلاموں کا جواب دے کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

''نور کہاں ہے؟'' انہوں نے امراؤ بیگم سے معلوم کیا۔ جوان بیٹی نے نامعلوم خواب نے ان کی آنکھوں کو بے خواب کر دیا تھا۔ ڈاکٹر، حکیم، نذر و نیاز کی ناکامیوں کے بعد انہیں صرف ایک بات یاد رہ گئی تھی اور جو نیشِ عقرب کی طرح ان کے دل و دماغ پر وار کر رہی تھی۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا اور اب تو ہر وقت یاد آنے لگا تھا کہ تقسیم ملک کے وقت اکثر دختران پر دہ نشین عالم غریب الوطنی میں سوتے سوتے چیخ پڑتی تھیں اور اپنی ماؤں سے لپٹ کر زار زار روتی تھیں۔ لیکن خواب کو بیان نہیں کر پاتی تھیں۔ انہیں خوب خوب یاد تھا کہ حافظ ابراہیم کی ۱۷ سالہ نواسی نے بھی اسی طرح خواب سے چونک کر خود کشی کر لی تھی۔ اور پنڈت ہری پرساد کی بیٹی نے بھی کوئی سپنا ہی دیکھا تھا جو شادی سے قبل ہی رقمِ ستی کی طرح آگ میں جل کر اپنے پران دے دیے تھے۔ اور اب نور نے ....''

''اپنے کمرے میں ہے۔'' امراؤ بیگم نے افتخار حسین کی بات کا جواب دیا۔

''اس نے اب بھی کچھ نہیں بتایا۔'' افتخار حسین بھی خواب جاننے کے لیے بے چین تھے۔

''کچھ کہتی ہی نہیں، اپنے کمرے کی کھڑکیاں تو پہلے ہی بند کر لی تھیں، آج تو دروازہ بھی بند کر لیا ہے۔ میں نے منع کیا تو کہنے لگی ''مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''اسے اس طرح اکیلا نہ چھوڑو۔ اس کے ساتھ رہو۔ اب تو مجھے بھی اس کے نامعلوم خواب سے ڈر لگنے لگا ہے۔ خدا نخواستہ ....'' افتخار حسین اتنا کہہ کر رک گئے اور پھر اس طرح کہنے لگے جیسے کوئی بات یاد آ گئی۔

''ہاں، وہ عشرت علی کی لڑکی نجمہ گم ہو گئی تجھی سنا ہے کہ رنڈیوں کے بازار میں ہے۔ کوئی پندرہ روز قبل دو ہزار روپے میں فروخت کر گیا تھا۔ لیکن ابھی صحیح پتہ نہیں چلا ہے۔ لوگ وہاں دیکھنے گئے ہیں لیکن اب مل بھی جائے تو کیا فائدہ؟''

''ہاں، اس بیچاری کی تو زندگی تباہ ہو گئی۔'' بلقیس جہاں نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

اور پھر سب خاموش ہو گئے۔ خاموشیاں سرگوشیاں کرنے لگیں۔

''پندرہ روز قبل۔ لیکن اس کے اغوا کو ڈیڑھ ماہ بیت چکا۔ پھر ایک ماہ وہ کہاں رہی۔ کس کس کے ساتھ رہی۔ کس کس کی ہوس کا شکار بنی۔''

' اچانک ان سرگوشیوں کے بیچ دروازوں کے پہروں کو توڑتی ہوئی ایک چیخ سب کے کانوں سے ٹکرائی۔ سب چونک پڑے۔ یہ نور محل کی آواز تھی۔ افتخار حسین اور امراؤ بیگم کے ساتھ بلقیس جہاں اور بیگم زرینہ بھی نور محل کے کمرے کی طرف بے اختیار دوڑ پڑیں۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ لیکن نور محل کی درد ناک چیخیں درو دیوار کو توڑتی ہوئی سب کے کانوں میں گرم شیشے کی طرح پہنچ رہی تھیں۔ اور وہ سب اندر ہی اندر شدت کرب سے چیخ رہے تھے۔ افتخار حسین نے بے تحاشا دروازہ پیٹا، اور بیٹی کو آواز یں دیں۔ لیکن جو اب صرف چیخوں کی شکل میں آ رہا تھا اور پھر افتخار حسین کی عزت و آبرو بچانے کے لیے دروازے کی چٹخنی خود بخود گر گئی اور دروازہ کھل گیا۔ اندر نور محل آگ کا شعلہ بنی ہوئی زمین پر لوٹ رہی تھی۔ امراؤ بیگم یہ منظر دیکھ کر تڑپ اٹھیں۔ سر کے بال نوچ ڈالے اور دہاڑیں مار مار کر چلّانے لگیں۔ حاجی افتخار حسین نے اپنے حواس کو قائم رکھتے ہوئے بیٹی کے جلتے ہوئے بدن پر لحاف ڈال دیا اور کچھ ہی دیر میں آگ خاموش ہو گئی۔

اسپتال کے بستر پر لیٹے لیٹے نور محل کو دو روز بیت چکے تھے لیکن ان دو روز میں اس نے ایک لمحہ کے لیے افتخار حسین اور امراؤ بیگم کو اپنے پاس سے جدا نہ ہونے دیا۔ وہ اب بھی خائف تھی لیکن اس نے نہیں بتایا کہ اس نے کیا دیکھا تھا اور کیوں اپنے جسم میں آگ لگائی تھی۔

اور جب اسپتال کی تیسری رات نصف کے قریب گزر چکی تھی تو نور محل ایک بار پھر خواب سے چونک کر چیخی، افتخار حسین اور امراؤ بیگم جو سو نہیں رہے تھے بلکہ سونے کی رسم ادا کر رہے تھے، دوڑ کر بیٹی کے قریب پہنچے۔ بیٹی پھر ماں سے لپٹ کر رونے لگی۔ افتخار حسین نے عالمِ بے قراری میں بار بار پوچھا۔

’’کیا بات ہے بیٹی۔ تم نے کیا دیکھا۔ کون تھا؟‘‘
’’وہ سب ـــــکتنے ڈراؤنے ہیں۔ نہیں! پہلی بار خواب سے چونکنے کے بعد نور محل نے اتنے الفاظ بولے۔
’’کون ہے بیٹی۔ کہاں ہے۔ ہاں بتاؤ۔ کیا دیکھا۔‘‘ افتخار حسین کا اضطراب اور بڑھا۔ جب نور محل کی سانسیں ذرا ہموار ہوئیں تو افتخار حسین نے پھر وہی سوالات کیے اور نور محل نے اپنی نظروں کو دور بہت دور لے جا کر یوں کہا۔
’’مسلسل کئی راتوں سے میں ایک ہی خواب دیکھ رہی ہوں۔‘‘ نور محل کی بات ابتدا پر افتخار حسین اور امراؤ بیگم اس طرح متوجہ ہوئے جیسے انہوں نے اپنے تمام اعضا کی قوّت، قوّت سامعہ کو بخش دی ہو۔ اور نور محل ان کے اس اشتیاق سے لاعلم کہہ رہی تھی:
’’ایک وسیع میدان ہے اور نجمہ بے یار و مدد گار اس میدان کے بیچ کھڑی ہے۔ کسی پناہ گاہ کی تلاش میں ہے اور مشرق کی سمت آس بھری نظروں سے دیکھتی ہے کہ اس سمت سے چند اوباش نوجوان اپنے ہاتھوں میں چاقو لیے اس کی طرف آتے ہیں۔ وہ بھاگنا چاہتی ہے لیکن بھاگ نہیں پاتی۔ وہ آوارہ نوجوان اس کی چیخوں کو اپنے قہقہوں کی تہوں میں دباتے ہوئے اس کے جسم کے کپڑے تار تار کر کے اسے برہنہ کر دیتے ہیں۔ پھر ایک ایک کر کے اپنے ناخونوں سے اس کے جسم کو لہولہان کرتے ہیں اور اپنے ناپاک ارادوں کو پورا کر کے اُسے اُسی میدان میں تنہا چھوڑ چلے جاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد نجمہ اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ پھر کہیں سے اس کے جسم پر کپڑے آ جاتے ہیں اور وہ پناہ کی آس میں مغرب کی سمت نگاہیں دوڑاتی ہے کہ اسے چند سپاہی اس سمت سے آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر خوشی کی لہر اس کے جسم میں دوڑ جاتی ہے کہ اب وہ ضرور محفوظ جگہ پر پہنچ جائے گی۔ سپاہی اس کے قریب آتے ہیں۔ وہ بے کس نگاہوں سے سپاہیوں کو دیکھتی ہے اور التجا کرتی ہے۔ اس کی اس بیکسی پر سپاہی قہقہہ لگاتے ہیں اور اسی قہقہہ لگانے کے بیچ ان کے ہاتھوں کے ناخن بڑھ کر بھیانک شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں درندگی سمٹ آتی ہے۔ وہ بڑھے ہوئے ناخن نجمہ کے کپڑوں کو پھر تار تار کر دیتے ہیں۔ جسم لہولہان ہو جاتا ہے اور وہ قانون کے محافظ اپنے گندے ارادوں کو پورا کر کے اسی سمت کو لوٹ جاتے ہیں۔
نجمہ کچھ دیر کے بعد پھر کھڑی ہوتی ہے۔ اور اُس کا جسم پھر کپڑوں سے ڈھک جاتا ہے۔ اس بار وہ جنوب کی سمت نظر یاس سے دیکھتی ہے کہ ایک معزز آدمی کی سواری آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جیسے کوئی بادشاہ ہو۔ ایک بار پھر مسرت اس کے دل میں امڈ آتی ہے۔ وہ سواری اس کے قریب آ کر رک جاتی ہے۔ وہ شخص غور سے نجمہ کو دیکھتا ہے۔ اور اپنے کندھے پر پڑی ہوئی قیمتی شال نجمہ کی طرف پھینک دیتا ہے۔ جیسے کے اسے پناہ دے رہا ہو، لیکن تھوڑی دیر بعد ہی مسکراتے ہوئے سواری سے اتر کر نجمہ کو اپنی باہوں میں کس لیتا ہے۔ نجمہ تڑپ بھی نہیں پاتی۔ جب وہ معزز شخص لوٹتا ہے تو نجمہ اسی میدان پڑی رہ جاتی ہے۔ چند ساعت کے بعد وہ پھر اٹھتی ہے۔ اس کا برہنہ جسم کپڑوں میں چھپ جاتا ہے اور اب وہ شمال کی جانب نظرِ حسرت دوڑتی ہے کہ آخری سمت ہے اور اس سمت سے جب ایک بزرگ کو آتے ہوئے دیکھتی ہے تو اپنی تمام بچی ہوئی خوش ہونے کی قوت سے خوش ہوتی ہے۔ وہ بزرگ کہ جس کے چہرے پر ریش دراز تھی، جسم پر زرد لباس تھا، گلے میں بڑی بڑی تسبیحیں پڑی تھیں ہاتھ میں چمٹا بجاتا ہوا اس کے قریب آیا۔ نجمہ نے اس کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا اور مدد کی بھیک مانگی اور اس بھیک میں اس درویش شکل آدمی نے اس کے جسم کے کپڑے اُتار لیے۔ نجمہ پھر اس میدان میں تنہا برہنہ پڑی رہ گئی۔ وہ شخص جا چکا تھا۔ اس بار وہ اٹھ نہیں سکی۔ اس کے جسم پر کپڑے نہیں آئے۔ وہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ آہستہ آہستہ میں اس کے قریب پہنچی اور جب میں نے اسے دیکھا تو میں چونک پڑی۔ وہ نجمہ نہیں تھی وہ۔ وہ میں تھی۔ میرا جسم برہنہ پڑا تھا۔ وہ لہولہان جسم میرا تھا۔‘‘
اتنا کہہ کر نور محل پھر اپنی ماں سے لپٹ کر رونے لگی۔ حاجی افتخار حسین کی زبان سے ایک حرف بھی نہ نکلا۔ تقسیم ملک کے وقت حافظ ابراہیم کی نواسی اور پنڈت ہری پرساد کی بیٹی نے بھی یہی خواب دیکھے تھے۔ انہوں نے نور محل کی طرف حسرت و یاس کی نظروں سے دیکھا اور ان حسرت و یاس کی نظروں سے بے کسی و بے بسی کے دو آنسو بہہ کر نور محل کے بستر میں جذب ہو گئے۔
***

ہند و پاک کے راستے کھلتے ہی اسے ایسا لگا کہ اب تک وہ نظر بند تھا اور اسے آزاد کیا گیا ہو۔ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ہندستان جانے کے لیے ویزا منظور کروایا اور بہت جلد اپنے گاؤں کی گلیوں کو نگاہوں میں بسا کر لاہور سے روانہ ہوا۔ اس نے اپنے آنے کی کسی کو اطلاع نہیں دی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اچانک اسے دیکھ کر چچا میاں اور دلہن چچی کتنا خوش ہوں گی اور شازیہ جسے پیار سے وہ شازی کہتا تھا، حیرت ومسرت سے اُچھل پڑے گی۔ بچاری کو کتنا انتظار کرنا پڑا ہے۔ ہر وقت اس کے کانوں میں میرے قدموں کی آہٹ دبے پاؤں آ کر دروازے پر نگاہیں اُٹھانے کے لئے اُسے مجبور کرتی ہو گی۔ کہیں شازی کی شادی! نہیں .... ایسا نہیں ہو سکتا ......! وہ تمام عمر میرا انتظار کر سکتی ہے ..... اور پھر وہ بیتے ہوئے دنوں کو یاد کر کے دھُندلی تصویروں میں رنگ بھرنے لگا۔

محرم کی ۹ تاریخ تھی۔ مہمان خانے میں کافی تعداد میں مہمان اکٹھّے ہو چکے تھے۔ رحیم گڑھ کے تعزیے دور دور تک مشہور ہونے کی وجہ سے محرم کا مہینہ لگتے ہی اس کے یہاں مہمانوں کی آمد شروع ہو جاتی۔ اس کی امی جان نے کہا کہ آج خالہ بی آئیں گی۔ وہ بہت خوش اور بے چینی سے ان کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ کئی برس کے تناؤ کے بعد خالہ بی آج آ رہی تھیں۔ اِدھر آفتاب نے اپنے شعاعوں کو سمیٹنا شروع کیا اُدھر ڈیوڑھی پر بیلوں کے گھنگھروؤں کی جھنکار نے شفق کی سرخی میں ایک دل کش موسیقی پیدا کر دی۔ سب لوگوں نے گھنگھروؤں کی جھنکار کو محسوس کر کے نظریں اس آواز کی طرف دوڑائیں۔ رحیمن بوا نے اندر آتے ہوئے تیزی سے کہا۔

''اے لوگو! دیکھو سکھیر پور کی سواریاں آ گئیں۔''

امی جان نے فرشی غرارے کے پائنچوں کو سنبھالتے ہوئے مسہری سے پاؤں نیچے اُتارے۔ وہ دوڑتا ہوا دروازے کی طرف بھاگا۔ خالہ بی آدھے سے اُتر چکی تھیں۔ اُس نے خالہ بی کو آداب کیا۔ اُنہوں نے اُسے پیار کیا۔ تب ہی اُس کے کانوں سے بہت سُریلی اور مہین آواز ٹکرائی۔

''بھائی جان آداب!''

اس نے خالہ بی کے پیچھے کھڑی ہوئی پیاری سی لڑکی کو دیکھا۔ ا می جان کہہ رہی تھیں کہ خالہ بی کے ایک پیاری سی لڑکی ہے۔ اس نے سر کو جنبش دے کر سلام کا جواب دیا۔ خالہ بی، رحیمن بوا، مہرن اور چمن کے ساتھ اندر چلی گئیں جو استقبال کے لئے پھاٹک پر آ گئیں تھیں۔ اس نے شازیہ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ آئیے، آپ ہمارے ساتھ چلیے۔ شازیہ کچھ مسکراتی اور جھجھکتی ہوئی اس کے ساتھ چلنے لگی۔ اس کا گورا رنگ عنابی رنگ کے کامدار غرارے اور جمپر میں دمک رہا تھا۔ غرارے کے پائنچوں کو اپنے بائیں ہاتھ سے پکڑ کر چلتی ہوئی وہ بڑی پیارا لگ رہی تھی۔ صحن میں امی جان اور خالہ بی چہک چہک کر اظہار مسرت کر کے کئی برسوں کا حساب برابر کر رہی تھیں۔ ان دونوں کو دیکھ کر امی جان نے سرگوشی کرتے ہوئے خالہ بی سے کہا ''اے دیکھو تو سہی اپیا، کیا جوڑی ملائی ہے قدرت نے۔''

''چشم بد دور! خدا سلامت رکھے دونوں کو۔'' خالہ بی نے ان دونوں پر شفقت و محبت کی نگاہ ڈالتے ہوئے دبی آواز سے کہا اور دُور سے بلائیں لے کر انگلیاں چٹخائیں۔ اس نے ایک بار گہری نظریں شازیہ کے دمکتے ہوئے چہرے پر ڈالیں جیسے اس کے کانوں نے ان دبی آوازوں کو سن لیا ہو۔ قریب آتے ہی امی نے شازیہ کو گلے سے لگا لیا۔

''بیٹے جاؤ، شازیہ کو اپنا کمرہ دکھاؤ۔ یہ تمہاری ہی مہمان ہے۔ اچھی لگتی ہیں نا''۔ اس نے آہستہ سے سر کو ہلا کر ہوں کیا تو خالہ بی اور امی جان دونوں ہنس پڑیں۔ وہ جھینپ گیا۔

وقت آگے بڑھا۔ معصوم کلیوں نے چٹکنا شروع کیا۔ امی جان نے تو رشتہ بھی پکا کر دیا۔ لیکن اُس کے ابا جان اس رشتے کو تیار نہ ہوئے۔ بات بھی ایسی کوئی خاص نہیں تھی۔ کافی عرصہ گزارا شازیہ کے ابّو الیکشن میں ابّا جان کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے تھے اور جلد ہی لوگوں کو سمجھانے پر ان کے حق میں بیٹھ بھی گئے۔ لیکن ابّا جان کے دل میں اسی وقت سے رنجش پیدا ہو گئی جو گھریلو تعلقات استوار ہونے پر بھی دور نہیں ہوئی۔ اور دوسرے ابا جان شازیہ کے ابو کو اپنے برابر کا زمین دار نہیں سمجھتے تھے۔ امی جان کی ان کے سامنے کیا چلتی۔ اللہ میاں کے گھر سے بلاوا آیا۔ بیٹے چہرے پر سہرا بندھنے اور شازیہ کو دلہن بنا کر گھر لانے کی آرزو کو کفن میں لپیٹ کر امی جان ہمیشہ کے لیے چلی گئیں۔ امی جان کے انتقال کے بعد خالہ بی کے ہاں آنا جانا بہت کم ہو گیا۔ لیکن وہ خالہ بی اور شازیہ سے ملنے ضرور جاتا رہا اور پھر ایک دن ابا جان رحیم گڑھ کی جائداد چچا میاں کے حوالے کر کے اسے اپنے ساتھ لے کر پاکستان چلے گئے۔ لیکن وہ پاکستان جانے سے قبل خالہ بی اور شازیہ کو یقین دلا گیا تھا کہ وہ بہت جلد واپس آئے گا وہ انتظار کریں۔ بد قسمتی سے ان کے جانے کے کچھ عرصہ بعد ہی ہندو پاک لڑائی ہو جانے کی وجہ سے راستے بند ہو گئے۔ درمیان میں کچھ وقت کے لیے راستے کھلے بھی تو ابا جان کی حالت اس قدر بگڑی کہ وہ انہیں چھوڑ کر نہ آ سکا۔ اور ماہی بے آب کی طرح تڑپتا رہا۔

رحیم گڑھ کے چھوٹے سے اسٹیشن پر اُتر کر اُس نے بستی تک جانے کے لیے سواری تلاش کی۔ سڑک پر رکشے، تانگوں کے علاوہ ایک بس بھی کھڑی تھی اسے یہ چیزیں عجیب سی لگ رہی تھیں کیوں کہ جب وہ یہاں رہتا تھا تو اس وقت اسٹیشن پر اتر

کر بیل گاڑی یا تانگے سے گاؤں جایا کرتے تھے۔ لیکن اب تو کچّی سڑک کی جگہ تارکول کی کالی سڑک بستی تک جا رہی تھی۔ رکشہ اسٹینڈ، تانگہ اسٹینڈ کے چھوٹے چھوٹے بورڈ لگ رہے تھے۔ وہ یہ سب تبدیلیاں دیکھ کر خوش تھا۔ ہاتھ کے اشارے سے ایک رکشہ والے کو بُلایا وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اپنے آنے کی اطلاع دیتا تو چچا میاں اس کے لیے سواری بھجوا دیتے۔

''کاں جانا ہے صاب''؟ رکشے والے نے اس کے قریب آ کر پوچھا۔ اس نے رکشے والے کو غور سے دیکھا۔ کیا اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ پہلے توکبھی کوئی گاؤں والا یہ نہیں پوچھا کرتا تھا۔

''ڈیوڑھی پر۔''

''کاں صاب''؟

''قاضی محمود حسین کی ڈیوڑھی پر۔'' اسے رکشہ والے کا یہ جواب عجیب سا لگا۔ کیوں کہ ایسے جواب کی اُمید نہیں تھی۔

''ہماری سمجھ میں نہیں آیا صاب کو قاضی محمود حسین؟ کس محلے میں رہتے ہیں۔'' نوجوان رکشے والے نے جو کسی فلمی ہیرو کے اسٹائل میں بال کاڑھے ہوئے تھا۔ لا علمی کا اظہار کیا۔ اس کا پائدان پر چڑھا ہوا ایک پیر سڑک پر واپس آ گیا۔

''بدتمیز ـــاتنا بھی نہیں جانتا ـــ بولنے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا۔'' ایک رکشہ والے کی زبان سے اپنے دادا کا نام اس طرح سن کر وہ جھنجھلا گیا۔

''اکڑتے کس پہ ہو صاب کوئی اور سواری دیکھ لو۔ پاگل ہے'' رکشہ والا بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

وہ رکشے والے کو دیکھتا رہ گیا۔ کچھ بول ہی نہ سکا اور پھر جھینپ مٹانے کے لیے تیزی سے بس میں سوار ہو گیا۔ بس نے بہت جلد اسے رحیم گڑھ کے مختصر سے بس اڈّے پر چھوڑ دیا۔ بس اڈّے ہی کی مناسبت سے وہاں اور لوگ موجود تھے۔

سڑک کے کنارے پر ایک کاٹھ کی دکان رکھی ہوئی چنگی کا کام دے رہی تھی۔ اس کے سامنے ہی چنگی کی بڑی سی بَلّی رسّی کے سہارے رُکی ہوئی تھی پختہ پُلیا کے قریب ایک اور کاٹھ کی دکان ہوٹل کی کمی کو پورا کر رہی تھی۔ اسی پر پان، بیڑی، سگریٹ کا بھی انتظام تھا۔ شیشے کے دو مرتبانوں میں چند بسکٹ اور تھوڑی دال پڑی ہوئی تھی۔ ٹھیلے کے پاس ایک شخص امرودوں کی آواز لگا رہا تھا۔ وہ چلنے لگا۔ رستے میں کھیلتے ہوئے بچے کھیلتے رہے۔ اِدھر اُدھر کام کرنے والے آدمی کام کرتے رہے۔ عورتیں اسی طرح گھومتی رہیں۔ پہلے تو ان کے گھر کا کوئی آدمی گزرا تھا تو بچے کھیلنا بند کر دیتے تھے۔ آدمی کا چھوڑ کر سلام کرنے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔ عورتیں لمبا سا گھونگھٹ نکال کر ایک جانب کو ہو جاتی تھیں۔ رحیم گڑھ جہاں وہ ایک لمبے عرصے کے بعد آ رہا تھا کتنا بدل گیا تھا۔ مٹی کے ٹوٹے پھوٹے مکانوں کی جگہ سیمنٹ کے پختہ مکانات نے لے لی تھی۔ سڑک اور گلیوں میں لگے ہوئے بجلی کے اونچے اونچے کھمبے پرانی لگی ہوئی لالٹینوں کو منہ چڑا رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہی پہلے جیسا گاؤں ہو گا جہاں برگد کے نیچے ماسٹر جی بچوں کو نیم کی پتلی شاخ سے مار مار کر پڑھا رہے ہوں گے۔ لیکن یہاں تو سب کچھ بدل گیا۔ برگد کے نیچے اسکول کی صاف ستھری عمارت بنی ہوئی تھی۔ جہاں سے گھنٹے بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ اپنے گاؤں کی اس قدر ترقی دیکھ کر وہ سوچنے لگا کہ کاش! ابا جان یہاں سے جاتے نہیں۔ اس نے تو کبھی تصوّر بھی نہیں کیا تھا کہ اس کا گاؤں اتنی جلد ترقی کی اتنی منزلیں طے کر لے گا۔ اسے اب بھی کچھ گلیاں یاد تھیں۔ چلتے چلتے وہ ایک بڑے پھاٹک کے پاس رک گیا۔ وہ اپنی حویلی کو پہچان گیا تھا۔ خوش خوش دل کی تیز دھڑکن کے ساتھ وہ اندر کی طرف بڑھا۔ لیکن راستے میں ایک آدمی نے روک کر پوچھا ''کس سے ملنا ہے بابوجی؟''

اس نے پوچھنے والے کو تعجب سے دیکھا۔ ''ارے کون ہو تم پوچھنے والے؟ یہ میرا گھر ہے چچا میاں کہاں ہیں؟''

''کہاں سے آئے صاحب؟ کون چچا میاں؟ کس کا گھر؟ یہ تو لالہ کشوری لال کا گودام ہے۔'' اس آدمی نے لا پرواہی سے کہا۔

لیکن یہ سن کر اسے شاک سا لگا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی نگاہیں دیواروں پر ڈالیں۔ دیواریں بدلی ہوئی ضرور تھیں لیکن اسے یقین تھا کہ یہی اس کا گھر ہے۔ اس نے نیم کے اس اونچے درخت کو دیکھا جس کے سائے میں اس کا بچپن گزرا تھا۔ اسی نیم کے نیچے کھڑے ہو کر وہ شازی کے ساتھ تعزیے دیکھا کرتا تھا۔

''بابو جی آپ غلط آ گئے ہیں۔ یہ تولا لہ جی کا گودام ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ اس نے ایک حسرت بھری نگاہ ڈیوڑھی پر ڈالی اور واپس جانے کے لیے کسی مایوس شکاری کی طرح قدم اٹھا دیے۔ اس کے ذہن میں ایک عجیب سا طوفان برپا ہو گیا۔ کیا قاضی محمود حسین کی ڈیوڑھی نیلام پر چڑھ گئی؟ کیا چچا میاں نے رحیم گڑھ چھوڑ دیا؟ کیا اب رحیم گڑھ میں اسے کوئی نہیں پہچانے گا؟ تاریک خیالات میں روشنی کی کرن تلاش کرتا ہوا وہ گاؤں کی نئی سڑک پر بڑھ رہا تھا کہ اس کی نگاہ مسجد پر گئی جس کے مولوی صاحب نے اسے قرآن شریف پڑھایا تھا۔ اس کے بھاری قدم مسجد کے دروازے پر رک گئے۔ وہ جوتے اتار کر آہستہ آہستہ اپنے بزرگوں کی بنوائی ہوئی مسجد کے صحن میں چلنے لگا۔ مسجد کے ایک جانب حجرے میں ایک سفید ریش بزرگ بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ وہ پہچان گیا۔ یہ وہی مولوی صاحب تھے جو اسے قرآن شریف پڑھانے آیا کرتے تھے۔ اس نے حجرے کی طرف بڑھ کر انہیں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام ـــکون ہے؟'' نابینا مولوی صاحب کا ہاتھ تسبیح پر چلتے چلتے رک گیا۔

''کیا آپ بھی مجھے نہیں پہچانیں گے؟'' اس کی آواز بھر گئی۔
''بیٹا آنکھوں سے معذور ہوں، کچھ کہو تو سمجھوں۔ لگتا ہے تم۔'' مولوی صاحب رک گئے۔
''ہاں مولوی صاحب میں ہو خالد۔ خالد۔''
''تم خالد میاں ــــپاکستان سے آئے ہو کیا؟'' مولوی صاحب نے ٹٹولنے کے لئے ہاتھ اٹھائے۔'' یہاں آؤ بیٹے۔ میرے قریب آؤ۔ میں تو آنکھوں سے معذور ہو گیا۔''
وہ مولوی صاحب کے قریب چلا گیا۔ مولوی صاحب نے اسے چمٹا لیا۔ اس کی آنکھوں سے خود بہ خود اشک بہنے لگے۔
''یہ کیا ہو گیا مولوی صاحب۔ یہ سب کیسے ہوا۔ چچا میاں کہاں چلے گئے؟'' اس نے اپنے اوپر قابو پانے کی کوشش کی۔
''بیٹا وقت کے ہاتھوں سب کچھ لُٹ گیا۔ گاؤں تو پہلے ہی نکل چکے تھے۔ جو کچھ جائیداد بچی وہ مقدموں کی نذر ہو گئی۔ تمہارے چچا میاں حویلی نیلام کر کے شہر چلے گئے۔ بیٹا بڑی بری حالت ہو گئی ہے۔ جب سے تم لوگ گئے ہو، محلے کے کچھ لوگ میرے آگے بھیک کی طرح کھانا ڈال دیتے ہیں۔ نہ جانے خدا کب اٹھائے گا۔'' مولوی صاحب نے آنکھوں کی نمی کو رو مال سے خشک کیا۔ ''تم کب آئے بیٹا قاضی صاحب کس حال میں ہیں؟''
''سیدھا ادھر ہی آیا ہوں۔ ابا جان کو بھی بڑھاپے نے آ گھیرا ہے۔ مولوی صاحب میں تو کہیں کا نہیں رہا۔ پاکستان میں یہاں سے گئے ہوئے مسلمانوں کی بڑی بُری حالت ہے۔ نوکری بھی مشکل سے ملتی ہے۔ یہاں سب کچھ لُٹ گیا۔'' اس کی آنکھیں پھر اُمنڈ آئیں۔ مولوی صاحب نے پدرانہ شفقت کا ہاتھ اس کے سر پر پھیرتے ہوئے کہا۔
''رو نہیں بیٹا۔ خدا بڑا رحیم ہے کوئی راہ نکالے گا۔''
''کیا آپ کو سکھیر پور والے خالو جان کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟''
''جب تک تمہارے چچا میاں یہاں تھے کبھی کبھی خبر مل جایا کرتی تھی لیکن اب مدّت سے کوئی خبر نہیں ملی۔ نہ جانے کس حال میں ہوں گے؟''
اور پھر اس نے مولوی صاحب سے رخصت لے کر سکھیر پور کے لیے تانگا کیا۔ اس کے ذہن میں بُرے بُرے خیالات گھر بنا رہے تھے۔ سکھیر پور بھی بالکل بدل گیا تھا۔ خالو جان کی حویلی پر پہنچ گیا، لیکن اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی حویلی ہے جو کسی زمانے میں دلہن کی طرح سجی رہتی تھی۔ لیکن اب جگہ جگہ سے دیواریں زمین سے جا لگی تھیں۔ دروازے کے بڑے بڑے پھاٹکوں سے برادہ جھڑ رہ تھا۔ اس نے لوہے کی بھاری زنگ آلود زنجیر کھٹکھٹائی۔ ایک بچہ میلے سے کپڑے پہنے اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔
''یوں کہنا رحیم گڑھ والے بھیا آئے ہیں۔''
بچہ تیزی سے اندر چلا گیا۔ وہ بھی بچے کا انتظار کیے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ صحن کی کچّی زمین نہ جانے کب سے لپی نہیں تھی۔ دو ایک پرانے بانوں کی خستہ حال اونچی اونچی چارپائیاں اپنی کہانی آپ سنا رہی تھیں۔ دیواروں پر سفیدی نہ ہونے کے سبب لونی کی پرتیں جم گئی تھے۔ بچہ نے اندر جا کر کہہ دیا تھا۔ رحیم گڑھ کا نام سن کر ایک بوڑھی عورت جس کے بال تقریباً سفید ہو چکے تھے، کمر قدرے جھکی ہوئی تھی، صحن میں آئی۔ اس نے بوڑھی عورت کو پہچان کر سلام کیا۔
''کون؟ خالد بیٹے۔ آؤ میرے لال۔ کب آئے؟'' خالہ بی نے اپنی بہن کی نشانی کو گلے سے لگا لیا۔
''جی آج ہی آیا۔ خالہ بی یہ سب کیا ہو گیا۔ آپ کی یہ کیا حالت ہو گئی؟''
''ہوتا کیا بیٹا۔ قسمت کا لکھا ہوا پورا کر رہے ہیں۔'' خالہ بی اس کے کندھے سے لگ کر رونے لگیں اس کا درد سے بھرا ہوا دل پھر رو پڑا۔ وہ بے چینی سے نظریں ادھر اُدھر دوڑا رہا تھا لیکن چند چھوٹے چھوٹے بچوں کے سوا کوئی دکھائی نہ دیا۔ باورچی خانے سے دھواں نکل رہا تھا۔ خالہ بی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
''بیٹے تم نے آنے میں اتنے دن لگا دیے۔ شازیہ تمہارا انتظار کرتے کرتے نہیں تھکی تو اس کے دل سے مسرت کی دھڑکنوں کی آواز آنے لگی۔ وہ بے قرار ہو گیا۔
''وہ کہاں ہے۔''
''شازیہ بیٹے دیکھوں کون آیا ہے۔'' خالہ بی نے آواز تودے دی لیکن بعد کو پچھتاوا سا ہوا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ شازی کو حاصل کرنے لیے ہی تو پاکستان سے آیا تھا۔ خالہ بی پان کھانے اندر چلی گئیں۔ باورچی خانے سے میلے کپڑوں کو صاف کرتی ہوئی ایک عورت نکلی۔ وہ کھڑا ہو گا اس کے منہ سے یک لخت نکلا ''شازی''۔
شازیہ شاید اپنے پردیسی محبوب کو دیکھنے کے لیے باہر نکلی تھی۔ اُس کے چہرے کی گلابی رنگت زردی اختیار کر چلی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے صاف نمایاں تھے۔ گلاب کی پنکھڑی جیسے نازک ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ اس کے ریشم سے ملائم بالوں میں چاندی کے تار چمکنے لگے تھے۔ وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھ گیا اور اسے بازوؤں کو تھام لیا۔

''یہ کیا ہو گیا شازی تمہیں۔ تم بولتی کیوں نہیں۔ میں ہوں تمہارا خالد۔ بولونا۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔''
لیکن شازیہ اسے گھُورے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی نمی سمٹ کر اس طرح پلکوں پر ٹھہری گئی تھی جیسے سُوکھی ہوئی پنکھڑی پر شبنم کے قطرے جم گئے ہوں۔ اس نے شازیہ کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔
''شازیہ تم خاموش کیوں ہو۔ میں اب بھی تمہارا ہوں۔ صرف تمہارا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔''
''تم نے بہت دیر کر دی خالد!'' شازیہ نے اس کے ہاتھوں کو الگ کرتے ہوئے کپکپاتے ہونٹوں سے کہا اور چہرے کو ہاتھوں میں چھپا کر باورچی خانے کے گندے دھوئیں میں گھس گئی۔ وہ بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ اُس نے گھوم کر دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر کا شخص گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ بچے ابّو، ابّو کی آواز لگا کر اس کی طرف دوڑ نے لگے وہ دیکھتا رہ گیا اُسے لگا جیسے ہندوستان اور پاکستان کے راستے ایک بار پھر ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے اور وہ پاکستان میں گھر گیا۔
***

آنکھوں کی سوئیاں

وہ اپنے گھر سے جب رکشہ میں بیٹھ کر بس اسٹاپ کی طرف جاتا تھا تو اس کا رکشہ ایک ایسی کالونی کے بیچ سے گذرتا تھا جہاں سڑک کے دونوں جانب بہت عالی شان کوٹھیاں تھیں۔ ہر روز وہ ان کوٹھیوں میں اپنے مکان کا نقشہ ڈھونڈتا تھا اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن ضرور اس کے لیے اس زمین پر اس کے تخیل میں بسا ہوا مکان ابھرے گا اور اس یقین کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور ایک اعلیٰ اور عزت دار عہدے پر فائز تھا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ آدمی زندگی کے بقیہ دن آرام اور عزّت سے گزارے۔ اس نے ہمیشہ ایک بڑے گھر کا خواب دیکھا تھا۔ ایسا گھر جہاں مصنوعی ہواؤں کے بغیر بھی رہا جا سکے۔ جہاں پھولوں کی مہک اور سبز گھاس آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچائے۔ اسی لیے اس نے سب کی مخالفت کے باوجود اپنے مکان کے لیے بڑی زمین لی تھی کہ اسے گھر بنانا تھا کرایہ خانہ نہیں۔ جہاں سانس لینے کے لیے مچھلی کی طرح پانی سے منہ نکالنا ہوتا ہے اور باتھ روم میں سمٹ کر نہانا پڑتا ہے۔ اس کا ایک دوست اس سے کہا کرتا تھا کہ کرائے مکانوں میں باورچی خانے اس لیے بہت چھوٹے ہوتے ہیں کہ کرائے کی رقم دینے کے بعد اتنے پیسے ہی نہیں بچتے کہ باورچی خانہ میں جانے کی ضرورت پڑے۔ کرائے کے مکانوں کو اس لیے بھی تکلیف دہ رکھا جاتا ہے کہ کرایہ دار زیادہ عرصہ تک وہاں نہ رہ سکے گا اس مکان میں اسے سکون نصیب ہوا تو وہ کبھی اسے خالی نہیں کرے گا۔
پھر ایک دن یوں ہوا کہ مکانوں کی تبدیلی اور ان کے مالک کے تقاضوں سے تنگ آ کر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی بڑی زمین میں چھوٹا سا گھر بنا لے تاکہ روز روز کی چق چق سے نجات ملے۔ سچ یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کے مکان بنوانے میں مالکِ مکانوں کا بھی ہا تھ ہے۔ ان کا بار بار کا تقاضا ہی کرایہ دار کو اس بات کے لیے مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے لیے کوئی مکان بنوائے۔ اس کے پاس بیک وقت اتنی رقم نہیں تھی کہ اپنے ذہن میں موجود اپنے مکان کے نقشہ کی تکمیل کر سکے، اس لیے اپنے تخیّل کے محل کو ذہن میں رکھ کر ایک حصہ کی ابتدا کی۔ وہ اس وقت بہت خوش تھا جب اس کے مکان کی پہلی اینٹ ایک بزرگ کے مبارک ہاتھوں سے رکھی گئی تھی۔ اس کی بیوی اور بچے اس طرح خوش تھے جیسے ان کے لیے محل تعمیر ہو رہا ہو۔ اس موقع پر اس کے قریبی عزیز جمع ہوئے تھے سب کو مٹھائی کھلائی گئی تھی۔ سب نے اسے مبارک بادیں دی تھیں۔ جس میں کہیں خلوص تھا کہیں حسد اور طنز بھی۔ مخلص وہ تھے جو بے مکانی کے کرب سے آشنا تھے یا اس سے درد کا رشتہ رکھتے تھے اور حاسد اور طنّار وہ تھے جو صرف اپنے آرام کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ دوسرے کی تکالیف ان کے لیے باعث سکون ہوتی ہیں اور سیڑھی پر چڑھتے ہوئے آدمی کے گرنے سے راحت ملتی ہے کہ ایسے لوگ ہر وقت اپنے پیروں کے نیچے بانس باندھے رہتے ہیں تاکہ ان کا قد سب سے بلند رہے۔
گھر کی تعمیر کا کام تیزی سے چل رہا تھا اپنے گھر کے بننے کی خوشی نے اسے آفتاب کی ہرن کے بدن کو کالا کر دینے والی دھوپ کے احساس کو ختم کر دیا تھا وہ سوا نیزے پر اترے ہوئے سورج کی تپش کو بدن میں چاندنی کی طرح اتار رہا تھا کہ اس کے چہرے کی جلد بھی جھلس کر سیاہ ہوتی جا رہی تھی۔ سب کی ہمدردیاں اور مشورے اس کے ساتھ تھے اسے اطمینان تھا کہ سب اس کے ساتھ ہیں اور اطمینان کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ابھی اس کے پاس پیسے تھے۔ ہر کام مرضی کے مطابق ہو رہا تھا۔ ہر شام جب وہ تھک کر لوٹتا تھا تو اس کی بیوی پوچھا کرتی تھی۔
''آج کتنا کام ہو گیا؟''
کبھی وہ کہتا کہ آج بنیادیں مکمل ہو گئیں۔ کبھی کہتا آج دیواریں چھ چھ فٹ اونچی اٹھ گئیں اور آج دیواریں چھت کی حد تک پہنچ

گئیں اور جب ایک دن اس نے کہا کہ آج چھت پڑ گئی تو اس کی بیوی اتنا خوش ہوئی کہ جتنا خوش وہ ہو سکتی تھی کہ اب اس کے سر پر اپنی چھت کا سایہ ہو گا۔ مائیکے اور سسرال کا گھر بھی اگرچہ عورت کا اپنا گھر ہوتا ہے لیکن وہ صرف اس گھر کو اپنا کہتی ہے جو اُس کا شوہر اُس کے لیے بنوائے کہ اس گھر کی دیواروں میں وہ محبت اور خلوص شامل ہوتا ہے جو اس کا شوہر اسے دیتا ہے۔ ہر آدمی کو اس گھر سے محبت ہوتی ہے جو وہ خود بناتا ہے وراثت میں ملا ہوا گھر گھر نہیں ہوتا۔ رہائش گاہ ہوتی ہے اس لیے اس میں رہنے والے افراد چاہے جب اسے فروخت کر دیتے ہیں یا تڑوا دیتے ہیں، ایک نسل دوسری نسل کے جان و دل کی طرح عزیز طرز کو بے دردی سے رد کر دیتی ہے۔

جس روز مکان کی چھت پڑی تھی اُس کی بیوی بہت دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی تھی کہ گھر کو کس طرح سجانا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''اب میں اپنا وہ سامان باہر نکالوں گی جو آج تک صندوقوں میں بند ہے''۔

اس نے اپنے گھر میں اتنا بڑا صحن بنایا تھا کہ بچے کھیلتے وقت گھر کی دیواروں سے نہ ٹکرائیں۔ اسے اپنے گھر کی تعمیر کے وقت اپنی ماں یاد آ رہی تھی کہ اس نے اپنی بیوی سے کہا تھا۔

''تم جانتی ہو کہ میری ماں ہمیشہ بہت بڑا گھر بنانے کے بارے میں سوچا کرتی تھی کیوں کہ وہ ایک زمیندار کی بیٹی تھی اور ایک ایسے گھر سے آئی تھی کہ جس کے آنگن میں دیو قامت درختوں پر لڑکیاں جھولے جھولا کرتی تھیں۔ میں اپنے گھر کا نام اپنی ماں کے نام پر رکھوں گا۔''

اس کی بیوی نے اس بات پر اعتراض نہیں کیا تھا کہ وہ تنگ دل نہیں تھی اور ماں کی محبت اور قدر جانتی تھی کہ ماں کا نام ہی مائیکہ ہوتا ہے۔ گھر اس وقت تک گھر ہوتا ہے جب تک اس میں ماں ہوتی ہے، اس کے بعد صرف رشتوں کی دیواریں رہ جاتی ہیں جو معمولی سی دھمک سے گر بھی سکتی ہیں، اس کی ماں نے بھی اس کے لیے قربانی دی تھی کہ اپنی بیٹی کا گھر بنوانے کے لیے اپنی اولاد سے چھپ کر اپنے زیورات رہن رکھ دیے تھے۔

اس کے مکان کی چھت ضرور پڑ گئی تھی لیکن اسی کی ساتھ ایک فکر نے اُسے آ گھیرا تھا کہ اب وہ رقم ختم ہو چلی تھی جو اس نے جمع کی تھی اور مکان کو رہائش کے لائق بنانے کے لیے ابھی کافی رقم در کار تھی۔ لا چار و مجبور دہ ہاتھ جو سرہانے دھرے دھرے سو گیا تھا عزیز اقربا کے روبرو دراز ہو گیا۔ اس نے آج تک کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا لیکن مکان کی تعمیر نے اس کی زبان کو اپنا مطالبہ پیش کرنے کا عادی بنا دیا تھا کہ اپنی چھت کے سایہ میں رہنے کے لیے یہ اس کی آخری کوشش تھی، اس کے ایسے عزیزوں نے اس کی مدد کی کہ جن کے پاس خود کچھ نہیں تھا لیکن اس کے ایسے عزیز جن کے پاس بہت کچھ تھا اس کا پھیلایا ہوا ہاتھ دیکھ کر اچانک پریشان حالی کا اظہار کرنے لگے۔ بالآخر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ اتنے دکھنے لگے کہ اسے اپنے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے پر گھِن آنے لگی۔ وہ سوچنے لگا کہ ایسی تعلیم سے کیا فائدہ جو رہنے کے لیے ایک گھر تک نہ دے سکے۔ وہ ان اجہل افراد کو دیکھ کر کڑھنے لگا کہ جن کے پاس جہالت کے ساتھ زندگی کو عیش و آرام سے گزارنے کے لیے سب کچھ افراط کے ساتھ موجود تھا۔ اس کے ذہنی تناؤ کو کم کرنے کے لیے اس کی بیوی اس سے کہا کرتی تھی۔

''اب کیا ہے صرف آنکھوں کی سوئیاں نکلنا باقی رہ گئی ہیں خدا اس تکلیف کو بھی دور کرے گا۔''

اسے یاد تھا کہ اس کی ماں بھی پریشانیوں کے آخری لمحہ میں یہی کہا کرتی تھی کہ اب تو صرف آنکھوں کی سوئیاں باقی رہ گئی ہیں۔ لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ آنکھوں کی سوئیوں کا نکلنا ہی سب سے تکلیف دہ مرحلہ ہے۔

اسی پریشانی کے دوران ایک دن اس کے مالک مکان نے مکان کے خالی کرنے تقاضا کرتے ہوئے پوچھ لیا کہ ابھی کتنا وقت اور لگے گا؟ اور اس نے کہا ٹھیک پندرہ دن بعد میں آپ کا مکان خالی کر دوں گا۔''

اور ہوا بھی یہی کہ سولہویں دن گھر کے دروازے پر ایک ٹرک کھڑا تھا اور وہ اپنا سامان اس میں رکھوا رہا تھا۔ اس کا سامان جاتے ہوئے دیکھ کر اس کے پڑوسی نے کہا۔

''بہت خوش قسمت ہو نئے گھر میں جا رہے ہو۔''

اس نے بڑے پُر سکون لہجہ میں کہا۔

''جی ہاں میں نے ایک اور گھر کرایہ پر لے لیا ہے۔''

پڑوسی نے چونک کر پوچھا۔

''اور وہ جو آپ نے بنوایا تھا؟''

''وہ بیچ کر میں نے سب کا اُدھار چُکا دیا۔ ابھی میری عمر مکان بنانے کی کہاں ہے۔ صرف تنخواہ پانے والے آدمی کو تو ریٹائر منٹ کے بعد مکان بنانے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔''

اتنا کہہ کر اس نے مکان کی چابی مالک مکان سپُرد کی اور بیوی بچوں کے ساتھ ٹرک میں بیٹھ گیا۔

***

گرم سُوٹ

تکیہ پر نئے غلاف کی طرح وہ اپنے بدن پر نیا سوٹ چڑھا کر کمرے سے باہر آیا خوشی سے اس کی بانچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ آج عرصۂ دراز کی آرزوئے دِلی عملی جامہ زیب تن کر کے اس کے رو برو آئی تھی۔ اپنی بے انتہا مسرتوں کو اُچھالتے ہوئے اس نے رسوئی میں بیٹھی ہوئی شانتا کو آواز دی۔
''اے شانتا ذرا جلدی سے اِدھر تو آ۔ بتا میں کیسا لگتا ہوں۔''
توے پر پراٹھا چھوڑ کر شانتا اس طرح تیزی سے اٹھ کر صحن میں آئی جیسے میکے سے کسی کے آنے کی خبر ملی ہو۔ آتے ہی دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو اس کے چہرے پر پھیر کر دسوں انگلیوں کو ایک ساتھ چٹخایا اور جلدی سے اپنے چہرے کو ہاتھوں سے چھپا لیا۔ ''ہائے رام کہیں میری نظر نہ لگ جائے۔ زبان سے تو کہا بھی نہیں جاتا کہ تم کیسے لگتے ہو۔''
''ہٹ پگلی تیری نظر بھلا مجھے کیوں کھانے لگی۔'' اس نے شانتا کے دونوں ہاتھوں کو اس کے چہرے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔
شانتا نے ایک بار پھر سرتا پا اسے بنظر غور دیکھا اور شرما سی گئی۔ جیسے آج پہلی بار اس کا دولہا اس کے سامنے آیا ہو۔
وہ کھڑا مسکرا رہا تھا اور خود بار بار اپنے جسم پر نظر دوڑا رہا تھا جیسے اس کے چہرے پر کوئی اجنبی جسم لگا دیا گیا ہو۔
شانتا نے بڑھ کر طاق میں رکھی ہوئی کاجل کی ڈبیا سے اپنی انگلی پر کاجل لے کر اس کے ماتھے پر لگا دیا تاکہ وہ نظر بد سے محفوظ رہے۔ رسوئی سے جب پراٹھے کے جلنے کی بُو آئی تو اسے خیال آیا کہ پراٹھا توے پر ہی دوڑ کر رسوئی میں واپس گئی۔ راجیش نے اپنے آپ کو سنوارتے ہوئے کہا۔
''اچھا شانتا میں چلتا ہوں۔ شام کو واپسی میں تمہارے لیے مٹھائی لاؤں گا۔'' شانتا نے توے کو نیچے اتار اور ایک پیالہ میں دہی لے کر باہر آئی۔
''لو یہ دہی کھا لو کسی کی بری نظر نہیں لگے گی۔''
اس نے دہی کھایا، ایک بار پھر آئنہ اٹھا کر اوپر سے نیچے تک دیکھا اور کام پر جانے کے لیے دروازے سے باہر آیا۔ شانتا دروازے پر کھڑی ہوئی اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔
راجیش ایک سرکاری آفس میں معمولی کلرک تھا۔ ایک مدّت سے ان کی خواہش تھی کہ وہ ایک گرم سوٹ سلوائے۔ تین سال پہلے جب اس کی شادی ہوئی تھی تو اسے یقین تھا کہ شادی میں ضرور اُسے سُوٹ ملے گا کیوں کہ اس کے اکثر ساتھیوں کی شاید میں سوٹ ملے تھے لیکن وہاں بھی اسے مایوسی ہوئی ایک دن اس نے شانتا سے بھی کہہ دیا تھا۔
''شانتا کیا ہمارے بھاگیہ میں دوسروں کے اُترے ہوئے پُرانے کوٹ ہی لکھے ہوئے ہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی نیا کپڑا لے کر کوٹ سلوایا ہو، ہمیشہ پرانا کوٹ خرید کر ٹھیک کرایا۔ کیا نئے کپڑے بڑے لوگوں کے لی ہی بنتے ہیں۔''
''ایسے نراش کیوں ہوتے ہو جی! آج پرانا دیا ہے تو ایک دن بھگوان نیا بھی دے گا۔'' شانتا نے دلاسا دیا تھا۔
''جانے وہ کون سا دن ہو گا شاید اس جنم میں نہیں برسوں سے میر ادل چاہتا ہے کہ ایک نیا سوٹ بنواؤں لیکن یہاں کھانا ہی بڑی مشکل سے ملتا ہے سوٹ بھلا کیسے بنے گا۔''
اس دن کے بعد سے شانتا نے قطرہ قطرہ جمع کر کے دریا بنانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اسے کئی عورتوں کی یہ باتیں بھی یاد تھیں کہ اب تو غریب سے غریب کے یہاں شادی میں سوٹ دیا جاتا ہے۔ یہ بات اسے بہت چبھتی تھی۔ اور جب وہ قطرات دو سال کے عرصہ میں دریا کی شکل میں سامنے آئے تو وہ خاموشی سے ایک دن راجیش کو لے کر بازار گئی اور اس کے لیے سوٹ کا کپڑا خرید کر درزی کے سپرد کیا۔ راجیش کو خود حیرت تھی کہ اتنے سارے روپے اس نے کیسے جمع کر لیے۔ جس روز سوٹ سلِ کر آنا تھا دونوں اس دن کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔
سوٹ پہن کر سڑک پر چلنا اسے عجیب سا لگ رہا تھا جیسے وہ سوٹ کی توہین کر رہا ہو، بار بار سوٹ کو دیکھنے کے سبب ایک آدھ بار اسے ٹھوکر بھی لگی اور وہ گرتے گرتے بچا، بس اسٹاپ پر بھیڑ دیکھ کر اس کے ذہن میں یہ خیال اُبھرا کہ بھیڑ کے ساتھ بھری ہوئی بس میں چڑھنے سے سوٹ مَسل جائے گا کیوں نہ اسکوٹر سے جاؤں۔ لیکن اسکوٹر میں تو اچھے خاصے روپے لگ جائیں گے۔ اتفاق سے ایک بس کچھ خالی سی آئی جس میں اُسے سیٹ بھی بآسانی مل گئی لیکن بس میں چڑھتے وقت جب ایک دیہاتی آدمی کا جُوتا اس کی پینٹ سے ٹکرا یا تو راجیش نے اسے جھڑک دیا۔

''دیکھ کے نہیں چڑھتا ہے۔ دوسرے کے کپڑے خراب ہوتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اُس نے رو مال سے پینٹ صاف کی جب کہ پینٹ پر ذرا بھی مٹی نہیں لگی تھی۔ راستے بھر وہ منظر آنکھوں میں سجاتا رہا کہ دفتر پہنچتے ہی سب اس کی طرف دیکھنے لگیں گے، مبارک باد دیں گے۔ صاحب بھی اُس کے سوٹ کی تعریف کریں گے۔ ان پر توکئی گرم اور ٹھنڈے سوٹ ہیں۔ بس سے اُتر کر وہ اس طرح آفس کے گیٹ کی جانب بڑھا جیسے اپنی کار سے اتر کر صاحب جا رہے ہوں۔ گیٹ پر دھرمو نے اس کا پُر جوش استقبال کیا۔

''نمستے صاحب...... آج تو نجر (نظر) ناہیں ٹکت۔ بہت جور دار (زور دار) ہے۔'' وہ بزرگانہ انداز میں مسکرایا اور اس کے سلام کا جواب دے کر آگے بڑھا۔ جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوا۔ ایک دم اس کے سب ساتھی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ جھینپ سا گیا۔ کرسیوں سے اُٹھے ہوئے لوگ ایک ایک کر کے اس کی قریب آ گئے جیسے اُس کے منتظر تھے۔

''ارے واہ....... کیا سوٹ مارا ہے کہاں سے مار دیا۔ جواب نہیں۔''

''مبارک ہو راجیش بابو۔ مٹھائی بھی لائے ہو۔''

''ویسے یار بالکل صاحب لگ رہے ہو۔ کہاں سے خریدا۔''

''کوئی صاحب انعام میں دے گئے ہوں گے۔''

''لگتا ہے سنڈے مارکیٹ کی دین ہے کبھی کبھی تو بڑا اچھا مال مل جاتا ہے وہاں۔''

''اور کیا یہ بڑے لوگ تو نئے نئے کپڑے یونہی دوچار دن پہن کر اتار پھینکتے ہیں۔''

''ارے یار ذرا درزی سے فٹ کرالو تو بالکل نیا سا لگتا ہے۔''

''ویسے یار تم قسمت والے ہو پورا سوٹ مل گیا بالکل نیا سا لگتا ہے۔ گیا تو میں بھی تھا پچھلے اتوار کو کتنے کا ملا۔''

وہ ان سب کے کلمات طنزیہ کا جواب دیے بغیر صاحب کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اندر سے جے رام کی آواز آ رہی تھی۔

''صاحب کچھ دن پہلے جو آپ کی دراز سے روپے غائب ہوئے تھے لگتا ہے راجیش کے ہاتھ لگ گئے نیا سوٹ سلوایا ہے۔ اپنی تو عمر گذر گئی تنخواہ بھی اس سے سو روپے زیادہ ہے لیکن کبھی نیا کوٹ بھی نہ سلوا سکے۔''

یہ جملے اس کے کانوں میں گرم شیشے کی طرح پہنچے۔ وہ چیخ پڑا۔

''نہیں ......نہیں .... یہ سب جھوٹ ہے۔'' اس نے اپنے جسم سے بکرے کی کھال کی طرح کوٹ اُتارا اور تیزی سے باہر کی طرف بھاگا دھَرمُو کے قریب پہنچتے پہنچتے وہ اُلجھ کر گر گیا۔ اس کے ٹھیک اوپر دیوار پر ٹنگا ہوا دھَرمُو کا خاکی سوٹ ہوا کے جھونکوں سے اِدھر اُدھر جھول رہا تھا۔

***

غُبار

بات ضلع ادھیکاری تک پہنچا دی گئی تھی۔ اس لیے سب گاؤں والے مطمئن تھے کہ اب سرکار خود کوئی حل نکالے گی تاکہ اس ضلع کے تمام گاؤں اس ناگہانی آفت سے محفوظ رہیں۔ ایسا نہیں تھا کہ آس پاس کے ضلعوں میں کوئی خوفزدہ نہ ہو۔ ہر طرف بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ راتوں کو مشعلیں جلا جلا کر پہرہ دے رہے تھے۔ ہر ایک کو یہ خطرہ تھا کہ یہ دل سب سے پہلے اُس کے گاؤں میں گھُس کر تباہی مچائے گا اور اسی لیے باوجود اس کے کہ اعلیٰ افسران تک بات پہنچ گئی تھی گاؤں والے خود اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچ رہے تھے۔ ہر روز ہر گاؤں میں چوپالوں پر بھیڑ لگ جاتی تھی اور آپس میں مشورے ہوتے تھے کہ کس طرح ہم اس دل کے حملہ سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ احمد گڑھ کا مکھیا چوپال کے حاضرین سے کہہ رہا تھا۔

''بھائیوں یہ ہم سب کے لیے بہت مصیبت کا وقت ہے۔ ہمارے کھیتوں میں اس وقت فصلیں کٹنے کے لیے بالکل تیار کھڑی ہیں اگر اُس دَل نے ہمارے گاؤں کا رُخ کیا تو ہم سب تباہ ہو جائیں گے۔''

سب لوگ انتہائی صبر و سکون سے مکھیا کی باتیں سن رہے تھے کہ ایک مسخرہ بیچ میں بول اٹھا۔

''ارے کا ہے پریشان ہوتے ہیں بھیّا ابھی تووہ دَل ہمرے گاؤں سے بہت دُور ہے ابھی تو چین کی نیند سوؤ۔''

سب نے غصہ بھری نظروں سے دیکھا مولوی احمد بخش نے حقّہ کاکش لیتے ہوئے کہا۔

''یہ تو باؤلا ہے اگر ہم نے ابھی سے انتظام نہیں کیا تو ہماری حال دلی اور محمد شاہ رنگیلے جیسا ہو گا۔''

احمد بخش نے خاموش ہونے پر مکھیا نے پوچھا۔
''کہو مولوی ان کے ساتھ کیا ہوا تھا۔''
پھر مولوی احمد بخش نے اس طرح قصہ سنایا۔
''ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ مغلوں میں محمد شاہ نام کا ایک بادشاہ تھا بہت رنگین مزاج اور عیش کرنے والا۔ اسی لیے اسے سب رنگیلا کہتے تھے۔ کہتے ہیں کہ جب نادر شاہ ہندستان کو تباہ کرتا ہوا دلّی کی طرف بڑھ رہا تھا تو کسی وزیر نے بادشاہ محمد شاہ سے کیا کہ نادر شاہ کرنال پہنچ گیا ہے اور جلد ہی دلّی تک آ جائے گا تو بادشاہ نے کہا ابھی آرام کروا بھی دلّی دُور ہے۔ اور اس طرح بادشاہ آرام کرتا رہا اور نادر شاہ دلی پہنچ گیا۔ اور بھیا نادر شاہ نے دلی میں آ کر جو تباہی مچائی تو اسے بیان کرنا مشکل ہے۔ کہتے ہیں کہ دلّی میں کوئی آدم زندہ نہیں بچا تھا ہر طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ خُدا ایسا دن کسی کو نہ دکھائے۔''
سب کے منہ سے اس طرح کی آوازیں نکلیں جیسے ان کے گاؤں میں نادر شاہی قتل عام ہو گیا اور موت کا سناٹا سائیں سائیں کر رہا ہو۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ دوسرے گاؤں کے لوگوں کو بھی اپنے ساتھ لے کر ضلع ادھیکاری کے پاس ایک بار پھر جایا جائے اور ان سے درخواست کی جائے کہ وہ جلد ضلع کی حفاظت کا انتظام کریں۔ اور اس فیصلہ کے بعد اس وقت ضلع کے تمام دیہاتوں میں یہ اطلاع بھیج دی گئی کہ کل سورج چڑھے زیادہ سے زیادہ لوگ ضلع ادھیکاری کے دفتر پہنچ جائیں۔ اور پھر یہی ہوا کہ دوسرے روز ضلع ادھیکاری کے دفتر کے سامنے ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ اس ہجوم میں مرد عورتیں اور بچے بھی شامل تھے اس لیے کہ جان سب کو عزیز تھی۔ وہ سب خاموش بیٹھے منتظر تھے کہ ضلع ادھیکاری ان کی درخواست سنے۔ وہ شر پسند نہیں تھے۔ لیکن پھر بھی پولیس کی لاٹھیوں کی زد میں تھے۔ کچھ دیر انتظار کے بعد ضلع ادھیکاری ان کے روبر آیا۔ سب کی بے چینی ختم ہو گئی۔ کسی نے ضلع ادھیکاری سے شکایت نہیں کہ وہ پچھلے گئی گھنٹوں سے اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ سب معصوم لوگ جانتے تھے بڑا افسر ہر وقت بڑے کاموں میں پھنسا رہتا ہے۔ ضلع ادھیکاری نے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا:
''دیکھئے ہمیں آپ لوگوں کے اوپر آنے والی آفت کی خبر ہے لیکن ہم ابھی کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم نے ریاست کے وزیر اعلیٰ کو اس کی اطلاع دے دی ہے۔ یہ صرف ہمارے ضلع کا نہیں پوری ریاست کا معاملہ ہے۔ ہمارے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے۔ جب تک اوپر سے کوئی حکم نہیں آتا ہم بے بس ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس معاملہ میں جلد کوئی کاروائی ہو گی۔''
ضلع ادھیکاری اتنا کہہ کر چلا گیا۔ وہ سب اپنے اپنے گاؤں واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے کہ ضلع ادھیکاری کے چند جملے سننے کے لیے اپنے گاؤں سے میلوں کا سفر پیدل طے کر کے آئے تھے۔ لیکن مطمئن تھے کہ اب بات وزیر اعلیٰ تک پہنچ گئی ہے اب ضرور اور جلد کچھ نہ کچھ حفاظت کا انتظام ہو جائے گا اور اسی اطمینان کے ساتھ وہ اپنے اپنے گاؤں لوٹ گئے۔ ایک دو روز تک ضلع ادھیکاری کی باتیں انہیں تھپکی دے دے کر سلاتی رہیں۔ لیکن جب انہیں خبر ملی کہ اب دَل سرحد پار کر کے ریاست کے علاقہ رام گڑھ پوکھران اور باربیڑا میں داخل ہو گیا ہے تو سب کی نیندیں حرام ہو گئی۔ اب پانی گردن تک آ گیا تھا جب کئی روز گزر جانے کے بعد بھی ضلع ادھیکاری کی جانب سے کوئی انتظام نہیں ہوا تو تمام ضلعوں کے لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اب ہمیں ریاست کے وزیر اعلیٰ کے پاس جانا چاہیے۔ اور وہ ایک بڑے ہجوم کی شکل میں اپنی ریاست کی راجدھانی میں پہنچے تو دیکھا کہ سڑکوں کے چاروں طرف پولیس گشت کر رہی ہے۔ جیسے وزیر اعلیٰ کو ان کے آنے کی خبر ہو۔ گشت کرتی ہوئی پولیس کے ہاتھوں میں ہتھیار دیکھ کر وہ سب گھبرائے لیکن کیوں کہ ان کا مقصد تخریبی نہیں تھا اس لیے آگے بڑھتے رہے۔ پولیس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وزیر اعلیٰ کی رہائش گاہ پر پہنچ کر ان سب نے اپنے اپنے گاؤں کے بچانے کی درخواست کی جس وقت وزیر اعلیٰ ان کے روبرو آیا تو وہ سب اتنے خوش ہوئے جیسے وہ دَل ان کا علاقہ چھوڑ کر گزر گیا۔ وزیر اعلیٰ انتہائی شفقت و محبت سے پیش آیا اور کہا۔
''ہمیں تمام علاقہ کے حالات کی خبر ہے اور ہم بچاؤ کے انتظام کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ اس خطرناک دَل سے صرف ہماری ریاست کو خطرہ نہیں ہے۔ بہت سی ریاستیں اس خوف سے پریشان ہیں بلکہ پورے ملک میں اس کے پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے تمام ریاستوں نے اپنے بچاؤ کے لیے مرکز سے مدد مانگی ہے۔ آپ لوگ اطمینان رکھیں جلد ہی کوئی نہ کوئی انتظام ہو جائے گا۔''
ایک بار پھر سب مطمئن ہو کر لوٹ گئے کہ بات اب مرکز تک پہنچ چکی ہے۔ اب تو سرکار ضرور کچھ نہ کچھ بچاؤ کا انتظام کرے گی۔ وہ سب خوشی خوشی گھر لوٹ رہے تھے۔ واپس جاتی ہوئی اس بھیڑ میں سے کسی نے کہا۔
''ہمارے اوپر آنے والی اس آفت کے پیچھے کسی دوسرے کا ہاتھ لکتا ہے۔''
ایک اور نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔
''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو اگر اس دَل کو سرحد پار ہی روک لیا جاتا تو ہم سکون کی نیند سوتے۔''

کسی اور نے کہا۔
''لیکن آج کل کون کسی کو سکون سے سونے دیتا ہے۔''
کسی اور نے تمسخر انہ انداز میں کہا۔
''اگر سرکار پہلے سے ہی سرحد پر جالیاں لگا دیتی تو یہ دَل سرحد کے اِس پار آ ہی نہیں سکتا تھا۔''
اس جملے کے ساتھ ہی ایک اور کی زبان میں گُدگُدی ہوئی۔
''ہاں بھیا سرکار نے تو کچھ نہیں کیا اب اپنے اپنے گاؤں کے چاروں طرف جالیاں لگا لو۔ میں تو اپنے کھیت کے چاروں طرف مچھرّ دانی لگا کر اس میں بیٹھ جاؤں گا۔ اس طرح کھیت بھی بچے رہیں گے اور میں بھی۔''
تھوڑی دیر کے لیے سب کے چہروں پر ہنسی آ گئی۔
اس بار جب وہ اپنے گھروں کو لوٹے تھے تو پہلے سے زیادہ مطمئن تھے کہ ان کے گاؤں کی حفاظت کی ذمہ داری حا کم اعلیٰ کے دربار میں پہنچ گئی تھی۔ ان سب کو یقین تھا کہ اب چند روز ہی میں دربار اعلیٰ سے حفاظت کا تمام سامان ان کے علاقہ پہنچ جائے گا اور وہ ایک بڑی تباہی سے بچ جائیں گے۔
وقت گزرتا رہا۔ ہر گاؤں کا ہر فرد کبھی اس طرف جہاں سے دَل کا حملہ ہونا تھا اور کبھی مرکز کی طرف دیکھتا کہ نہ جانے کس وقت امدادی دستہ ان کے گاؤں پہنچ جائے۔ بات ایک ریاست سے نکل کر پورے ملک میں پھیل چکی تھی۔ کسی ایک گاؤں یا ایک ریاست کو نہیں بلکہ پورے ملک کی شادابی کو خطرہ تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ مرکز میں بے چینی نہ ہو۔ تمام وزراء بھی فکر مند تھے اور حاکم اعلیٰ نے سبھی ریاستوں کو بھر پور تعاون دینے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ مختلف کمیٹیاں بٹھا دی گئی تھیں جنہیں اس بات کی بھی تحقیق کرنی تھی کہ آخر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ حروف مٹے ہوئے ہیں۔ ۔ ہو رہی تھی کہ اس سے پہلے اس دل نے کہاں کہاں تباہی مچائی ہے۔ ایسے سبھی ملکوں میں تحقیقات کے لیے اور بچاؤ کے طریقے جاننے کے لیے وفد بھیج دیے گئے تھے۔ سب کچھ ضابطہ کے مطابق ہو رہا تھا۔ گاؤں والوں کو ریڈیو، ٹی وی اور اخباروں کے ذریعہ اطمینان دلایا جا رہا تھا۔ یہی اطمینان انہیں تھپکی دے کر سلا دیتا تھا۔
پھر ایک دن ایسا ہوا کہ اچانک سورج کی چمکتی ہوئی دھوپ میں ایک سمت سے بادلوں کا ایک جھنڈ آتا دکھائی دیا جیسے جیسے وہ قریب آیا اندھیرا پھیلتا چلا گیا اور اسی کے ساتھ پورے گاؤں میں چیخ و پکار شروع ہو گئی جس بات کا ڈر تھا وہی ہوا، امدادی سامان کے آنے سے پہلے ہی ٹڈّیوں کا دَل پہنچ گیا تھا۔ ذرا سی دیر میں ٹڈّیوں کا وہ دل آسمان پر چھا گیا اور پکی ہوئی فصلوں پر ٹوٹ پڑا اور فصلوں کو تباہ کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ سب روتے پیٹتے رہ گئے اور پھر ان کے آنسوؤں کو پونچھنے کے لیے وزیر اعلیٰ ضلع ادھیکاری کے ساتھ وہیں پہنچا اور کہا۔
''بڑے دُکھ کی بات ہے کہ ٹڈّی دَل نے ہماری فصلوں کو تباہ کر دیا۔ سرکار اس کی باقاعدہ چھان بین کرے گی۔ جن کسانوں کا نقصان ہوا ہے انہیں دو دو ہزار روپے سرکار کی طرف سے دیے جائیں گے۔''
وزیر اعلیٰ یہ اعلان کر کے چلا گیا۔ ایسا لگا جیسے سب کچھ ٹھہر گیا ہو۔ احمد گڑھ کے مکھیا نے مولوی احمد بخش سے کہا۔
''مولوی ابھی دِلّی دُور ہے۔''
مولوی احمد بخش نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔
''نہیں مکھیا جی! نادر شاہ دِلّی لُوٹ کر چلا گیا۔''
***

ہَستک چھیپ

پھر وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ ''ہر انسان برابر ہے خدا نے سب کو یکساں بنایا ہے ہر شخص کے اعضائے بدن ایک سے ہیں۔ ایک ہی طرح جنم لیتا ہے، ایک ہی طرح کھاتا پیتا ہے ایک ہی انداز سے موت کے آغوش میں سو جاتا ہے۔ پھر ہم سب میں اتنا فرق کیوں ہے کیوں ہم نے انسانوں کی اس برادری کو طبقوں میں تقسیم کر لیا ہے؟ کس لیے یہاں کوئی چھوٹا ہے کوئی بڑا کیا آپ جانتے ہیں کہ دنیا کے دوسرے ممالک کے مقابلے میں ہماری قوم پچھڑی ہوئی کیوں ہے ...... اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے خود کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ یہی تقسیم ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے کیوں کہ ہم ہر

فرقے کو اپنے سے کمتر سمجھتے ہیں۔ آج میں اعلان کرتا ہوں کہ اس سوسائٹی میں ہر طبقے کا حق برابر ہے۔ آج سے پسماندہ طبقے کے افراد کو ہر شعبے میں برابر کا درجہ حاصل ہو گا۔‘‘

وزیر اعظم کا یہ تاریخی اعلان برفتار برق پورے ملک میں پھیل گیا او پھر ہوا یوں کہ وہ بھی جو صدیوں سے اعلیٰ ذات کے افراد کے قدموں کے نیچے دبے رہنے کی وجہ سے ہنسنا بھول گیا تھا، بہت خوش ہوا، سب نے اپنے گھروں میں مستقبل کے تابناک خوابوں سے چراغاں کیا۔ وہ سب سوچنے لگے کہ اب ہمارے بچے ہماری طرح اَن پڑھ نہیں رہیں گے اور نہ نوکری کے لیے جگہ جگہ ٹھوکریں کھائیں گے۔ اب ہمیں نیچ ذات کہہ کر دھُتکار انہیں جائے گا۔ ہم ایک عام عزّت دار شہری کی طرح سر اُٹھا کر چلیں گے۔ انہی دبے کچلے لوگوں کی بستی میں ایک گھر رام پیارے کا بھی تھا۔ رام پیارے نے تمام زندگی شہر کو صاف کرنے میں گزاری تھی لیکن اپنی زندگی کے میل کو صاف نہیں کر سکا تھا، زندگی کے اسی میل کی صفائی کے لیے اس نے اپنے چاروں بچوں کو تعلیم دلوانے کا فیصلہ کیا تھا جس سے وہ خود محروم تھا۔ اس کی خواہش اور کوشش کا نتیجہ ہی تھا کہ اس کا بڑا بیٹا رتن لال بی اے تک پہنچ گیا تھا۔ رام پیارے کو رتن لال سے بہت اُمیدیں وابستہ تھیں اور اب وزیر اعظم کے اعلان کے بعد اسے اپنے خوابوں میں سچائی کی چمک دکھائی دینے لگی تھی .... لیکن دوسری طرف اعلیٰ ذات کے افراد یہ اعلان سن کر تڑپ اٹھے تھے۔ ان کے درمیان کھلبلی مچ گئی تھی۔ ہر شخص پریشان تھا کہ اس کی انا کو ٹھیس لگی تھی۔ انہیں یہ سوچ کر ہی گھِن آ رہی تھی کہ سماج کا وہ طبقہ جو صدیوں سے ہماری خدمت کرتا آیا ہے، اب ہمارے قریب بیٹھے گا بلکہ بعض مقامات پر ہم سے بلندی پر پہنچے گا اور ہم اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں گے۔ سماج میں ہماری انفرادیت اور حیثیت ختم ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ آئندہ زمانے میں یہی طبقہ ہمارے اوپر حکومت کرنے لگے اور ہماری حیثیت پسماندہ طبقے کی ہو جائے۔ وہ سب ہی متفکر تھے اور سوچ رہے تھے کہ وزیر اعظم کے اس حکم کے نفاذ کو روکنے کے لیے کون سی تدابیر کی جائیں۔ ملک کے مختلف شہروں میں موجود اعلیٰ ذات کے افراد نے ایک دوسرے سے مشورے شروع کر دیے، پھر یہ طے پایا کہ سب مل کر احتجاج کریں گے۔ حکومت کے اس اعلان کے خلاف مظاہر کریں گے کہ ہماری حیثیت سماج میں سب سے رجوع کیا۔ انہیں نے کہا کہ اگر اس وقت تم لوگوں نے خاموشی سے اس کو قبول کر لیا تو سماج میں اسی طرح با عزّت بنے رہو گے۔ ان ہی مذہبی رہنماؤں کے مشورے سے اعلیٰ ذات کے افراد نے بڑے بڑے جلسوں کا انعقاد کیا جن میں کہا گیا کہ:

’’یہ حکومت ناستک ہے، دھرم کو بھرشٹ کر رہی ہے ہماری صدیوں سے چلی آ رہی پرمپرا کو ختم کر رہی ہے۔ کوئی بھی آدمی چھوٹا بڑا ہمارے بنانے سے نہیں بنتا بلکہ بھگوان اسے چھوٹا بڑا بناتے ہیں۔ یہ سب آدمی کے کرموں کا پھل ہوتا ہے۔ سنسار میں جو اچھے کام کرتا ہے اس کا جنم اُچیہ کوٹی میں ہوتا ہے اور جو برے کرم کر کے یہاں سے جاتا ہے، اسے نچلی جاتوں میں پیدا کیا جاتا ہے۔ یہ سب ایشور کی مایا ہے کہ کس کا جنم کہاں ہو گا۔ انسان کا اس میں دخل دینا ایشور کو للکارنا ہے۔ دھرم کا ورودھ کرنا ہے۔ ہمارا اتہاس کہتا ہے کہ شودر کو بستی سے باہر بساؤ لیکن یہ سرکار انہیں ایوانوں میں بلا رہی ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ کسی شودر کو بھگوان کے درشن کے لیے مندر میں پرویش کی اجازت نہیں ہے۔ مندر میں اس کے داخلے سے مندر اَپوتر ہو جاتا ہے اور یہ بات بھی ہمارے اتہاس میں لکھی ہے کہ پوترا شلوکوں کی آواز شودر کے کانوں میں چلی جائے تو ان کی پوترتا ختم ہو جاتی ہے۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ جب کوئی شودر پوتر اشلوک سن لیتا تھا تو اس کے کانوں میں گرم سیسہ ڈالا جاتا تھا کہ ان اشلوکوں کی اپوترتا ختم ہو جائے اور نہ کوئی شودر کسی اشلوک کو یاد کر سکے۔‘‘

پورے ملک میں اس طرح کی سبھاؤں کا اہتمام کیا گیا اور دھرم کے نام پر انسانی برادری کی طبقاتی قسم کو جائز قرار دیا گیا تاکہ وہ مٹّھی بھر افراد جو سماج کے ہر شعبے میں اپنی اجارہ داری جمائے ہوئے ہیں، مشتعل ہوں اور ان کے اشتعال سے خوفزدہ ہو کر وزیر اعظم اپنا حکم واپس لے لے۔ لیکن وزیر اعظم اپنے فیصلے پر قائم تھا۔ وزیر اعظم کے اس عزم و ارادہ کو دیکھ کر غم و غصہ کی لہر سے چنگاریاں نکلنے لگیں اور ان چنگاریوں نے سرکاری املاک کو نقصان پہچانا شروع کیا۔ ملک گیر پیمانے پر ہڑتالیں کی گئیں۔ ریلوں اور بسوں کو نذر آتش کیا گیا۔ عوام کو ستایا گیا تاکہ حکومت وقت تنگ آ کر اپنا فیصلہ و اپس لے لے، لیکن نہ وزیر اعظم اپنا فیصلہ بدلنے کو تیار تھے اور نہ اعلیٰ طبقے کے افراد بچھڑے ہوئے لوگوں کو اپنے برابر بٹھانے کے لیے آمادہ تھے۔ انہیں اس بات کے تصور سے ہی ذلّت کا احساس ہوتا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ رام پیارے کو ملک میں ہونے والے ان ہنگاموں کا پتہ نہ ہو، اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اعلیٰ ذات کے افراد اس حکم کے نفاذ کو روکنے کے لیے ہر طرح سے کوشاں ہیں۔ وہ ہر روز شام کو چائے کے ہوٹل میں بیٹھ کر خبریں ضرور سنتا تھا اور پھر کافی دیر تک ملک کی موجودہ صورت حال پر لوگوں کے درمیان ہونے والے تبصرے میں شرکت کرتا تھا۔ پسماندہ طبقے کی بستی کے لوگ مستقبل کی خوشیوں اور اندیشوں پر اس طرح گفتگو کرتے جیسے ملک کے اہم سیاسی اور سماجی فیصلے انہی کے مشوروں کو مدّ نظر رکھ کر کئے جائیں گے۔ چائے کی چُسکی لیتے ہوئے کوئی وزیر اعظم کی بے بسی پر اس طرح رائے دیتا:

’’بھیا جی .... ہمارا پردھان منتری تو اس وقت مصیبت میں پھنس گیا ہے ابھی مسجد مندر کا رگڑا ختم نہیں ہوا تھا کہ آرکچھنڑ

کا آن پھنسا۔ ۔ بے چارے کی سانپ کے منہ میں چھچھوندر جیسی حالت ہو رہی ہے۔''
کوئی اور کہتا:
''یار یہ مجت مندر کا جھگڑا بھی لمبا کھنچ گیا، سالا روز کئیں نہ کئیں اس بات پر فساد ہو جاوے ہے۔ ستیانس کر دیا اس دیس کا جھگڑے نے .... سالے لڑوانے والے تو بیٹھے رہ ویں بنگلوں میں .... مارا جاوے غریب آدمی .... کبھی سنا کوئی لیڈر پولیس کی گولی سے مارا گیا۔ وہ تو بھاشن دے کر لڑوانا جانیں بس لڑوانا۔'' تیسرا اپنی بات اس طرح شروع کرتا:
''ارے یار سب کرسی کا چکر ہے۔ سب اپنی اپنی لیڈری چمکا رئے ہیں۔ نہ کوئی وہاں رام کی پوجا کرنے جا ریا اور نہ نماج پڑھنے .... یہ سب ہمارے لیڈروں نے انگریجوں سے سیکھا ہے۔ مندر بن گیا تو پبلک کو کس کس بات پر لڑوائیں گے اور کس بات کی دہائی دے کر ہمدردی اور ووٹ مانگیں گے۔ ورنہ مندر بنانا ہوتا تو محت کے پاس اِتّی جگہ پڑی ہے بنا لیتے۔ ہجاروں سال پرانی بات ہے کیا پتہ ہے کسی کو کہ رام جی اسی مجّت میں پیدا ہوئے تھے۔ جا کے ان لیڈروں سے پوچھا جائے کہ ان کا جنم استھان کون سا ہے تو سیدھے اپنی ماتا جی کے پاس پوچھنے جائیں گے۔ ارے بھیا آج کل اپنا جنم استھان یاد نہیں ہوتا۔ ہجاروں سال پہلے کی بات پکّی مالُم ہے .... کیوں رام پیارے تجھے مالّم ہے اپنا جنم استھان۔ کون سی جھگی میں پیدا ہوا تھا۔''
لیکن رام پیارے اس وقت ان باتوں میں بالکل دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ وہ تو مستقل اسی جوڑ توڑ میں لگا ہوا تھا کہ آرکچھنڑ سے اس کے پریوار کو کتنا فائدہ پہنچے گا۔ وہ کہنے لگا۔ ''چھوڑو یار اس مجّت مندر کے جھگڑے کو...... اپنا دھرم تو پیٹ پوجا ہے۔ یہ بتاؤ یہ آرکچھنڑ والا کانون کب سے لاگو ہو گا۔''
''ہاں بھیاں تیرا لونڈا تو اب بی۔ اے پاس ہونے والا ہے۔ تجھے تو اس کے ڈپٹی کلکٹر بنانے کی فکر ہو گی۔''
رام پیارے کو یقین تھا کہ اس کا بیٹا رتن لال ضرور کلکٹر بنے گا اور اس کی بقیہ زندگی آرام اور عزت سے گزرے گی۔
''ہاں بھئی سوچا تو یہی ہے کہ اگر رتنے نے بی۔ اے پاس کر لیا تو کلکٹری کی پریکچھا میں بٹھاؤں گا۔''
''لیکن یار ابھی تو لگتا نہیں کہ یہ کانون لاگو ہو جائے گا۔ ان اونچی جات برادری والوں نے بڑا ہنگامہ کر رکھا ہے۔ پورے دیس میں آرکچھنڑ ورودھی آندولن ہو رہے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں کب سرکار کا ارادہ بدل جائے۔ ہیں تو سب ایک ہی تھیلے کے چٹّے بٹّے۔''
''ابے یہ سب ووٹوں کا چکر ہے ہر نیتا چاہ رہا ہے کہ غریب لوگوں کے ووٹ کسی نہ کسی طرح اس کے ہاتھ میں رہیں۔ آندولن کروانے والے بھی لیڈر ہی ہیں۔''
لیکن یار ان لیڈروں کے جھگڑے میں اپنا تو لابھ ہو گا۔ آرکچھنڑ والا کا نون چاہے کوئی لاگو کرے، فائدہ تو ہم لوگوں کا ہی ہو گا۔ رام پیارے کو اپنے بیٹے کے مستقبل کی فکر تھی۔''
''ہاں پھائدہ تو ہو گا لیکن ہو گا جب .... جب کانون لاگو ہو گا ...... اس وخت تو خود پردھان منتری کی لٹیا ڈوبتی نظر آری ہے۔ اب تو دیس کے چھاتروں نے آندولن شروع کر دیا ہے۔ سنا نہیں کہ ایک بس اڈے پر ڈیڑھ سو بسوں میں آگ لگا دی۔ پندرہ بیس کروڑ میں آگے لگ گئی۔''
''ار تم بسوں میں آگ لگانے کی بات کر رہے ہو۔ یہ لونڈے تو اپنے شریر پر تیل چھڑک کر آگ لگا رہے ہیں۔ جندہ جل رہے ہیں۔''
''ارے یہ سب ڈرامہ باجی ہے۔ کوئی آگ واگ نہیں لگاتا ..... آتم ہتیا کرنی ہو گی۔ سوچا چلو ایسے جل مرو۔ نام ہو گا۔ اکھبار میں کبھر آئے گی۔''
''تو کیا ایسے آندولنوں سے ڈر کر سرکار اپنا حکم واپس لے گی؟'' رام پیارے نے سوالیہ بات کی۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر حکومت نے اپنے فیصلے کو بدل دیا تو اس کے خوابوں کا محل چکنا چور ہو جائے گا۔
''بھیا کچھ نہیں کہا جا سکتا کس کل اونٹ بیٹھے .... غریبوں کا حک کس نے دیا ہے۔ کسی کی ترگّی ورگّی نہیں ہو گی جو جہاں ہے وہیں رہے گا ...... غریب کو کوئی سوئیکار نہیں کرتا۔ مہابھارت میں دکھایا نہیں تھا کہ گرو درونا چاریہ شودر پُتر کو شکچھا دینے سے منع کر دیا تھا اور کرن کو شودر پتر سمجھ کر کسی نے عجت (عزت) نہیں دی۔ جو پرمپرا یگوں سے چلی آ رہی ہے اسے بدلنا آسان نہیں ہے۔''
وہ سب ان باتوں میں محو تھے کہ ٹرانسسٹر پرچار کا اعلان ہوا، سب کی توجّہ ادھر مبذول ہوئی۔ ٹرانسسٹر سے آواز آ رہی تھی۔
''دیش میں آج بھی آرکچھنڑ وردھی آندولن جاری رہا۔ کئی چھاتروں نے آتم داہ کی کوشش کی جگہ جگہ ٹرینوں کی روکا گیا اور بسوں میں آگ لگائی گئی جس سے یاتریوں کو کافی دشواری پیش آئی .... آج تیسرے پہر ایک نوجوان نے پردھان منتری پر قاتلانہ حملہ کیا۔ نوجوان کو فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ رتن لال نام کا یہ نوجوان بی۔ اے کا چھاتر ہے پوچھ تاچھ کے دوران اس نوجوان نے بیان دیا کہ میں پردھان منتری کے آدرشوں کی قدر کرتا ہوں لیکن انہیں اس لیے مارنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے ایشور کی نیتی میں ہستک چھیپ کیا ہے۔ جب ایشور ہی نے ہمیں نچلی جاتی میں پیدا کیا ہے کسی ویکتی کو کیا ادھیکار ہے کہ ہماری

جاتی کو بدلے ......''
ٹرانسسٹر سے خبریں نشر ہوتی رہیں لیکن رام پیارے وہاں سے اٹھ کر آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی اسے آنگن میں پڑی ہوئی اپنی جھاڑو نظر آئی۔ اس نے بڑے احترام سے اسے اٹھایا اور گھر کی سب سے اونچی جگہ ڈھونڈنے لگا جہاں اسے رکھ سکے۔
***

کچّے گھڑے

پورے دس سال بعد گاؤں کی طرف جاتی ہوئی چیچک کے داغوں جیسی سڑک پر ہلکورے کھاتے ہوئے تانگے میں بیٹھ کر وہ اپنے وطن واپس لوٹ رہا تھا یہ پہلا اتفاق تھا کہ اسٹیشن پر کھڑے آدمی اس کا سامان اٹھانے کے لیے دوڑے نہیں تھے اُسے یاد تھا ایک مرتبہ وہ کچھ دن باہر رہ کر گاؤں واپس آیا تھا تو بندوق بردار ایک گھوڑا اس کی سواری کے لیے اسٹیشن آئے تھے۔ گھوڑے کی سواری کا شوق اسے پچپن ہی سے تھا۔ ''بھیّا آ گئے'' بھیاّ آ گئے'' کی آواز لگاتے ہوئے بہت سارے آدمی اس کا سامان اٹھانے کے لیے دوڑے تھے لیکن اس مرتبہ کسی تانگے والے نے بھی اسے نہیں پہچانا۔ جیسے وہ یہاں کے لیے اجنبی ہو۔ سجاد کے سامنے اس کی یہ پہلی توہین تھی۔ سجاد کو اس کا احساس بھی نہ تھا لیکن پلیٹ فارم سے تانگے تک سامان لے جانے میں اسے اپنا وقار گھٹتا ہوا معلوم ہوا تھا۔ تانگہ برابر اپنی ایک ہی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔
''دیکھو سجاد وہ جو تالاب ہے یہاں صبح کے وقت بہت قازیں گرتی ہیں۔ کل ول یہاں آئیں گے۔ تم تو چلا لیتے ہو بندوق۔ اپنے یہاں پوائنٹ ٹوٹو اور ٹولیو بور دونوں ہیں چاہے جو چلانا۔''
''کیوں شمیم تم کب تک گاؤں ٹھہرو گے سروس کے لیے کہیں اپلائی کرنا ہے یا نہیں، اب لندن تو جانا نہیں ہے۔'' سجاد نے تالاب سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا۔
''لاحول ولا قوۃ یار ابھی سروس وروس کون کرے گا۔ ابھی تو اپنے گاؤں میں رہ کر زمینداری کریں گے۔ بڑے مزے کی زندگی ہوتی ہے۔ پورا گاؤں کہنے پر چلتا ہے جدھر چلے جاؤ سلام کرنے کے لیے لوگ اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں کسی دوسرے گاؤں جاؤ تو محافظین کا ایک دستہ معہ بندوقوں اور لاٹھیوں کے ساتھ میں ہوتا ہے جیسے کسی ملک کا پرائم منسٹر جا رہا ہو۔''
''میں نے سنا ہے کہ گاؤں کے زمیندار کسانوں پر بڑا ظلم کرتے ہیں۔'' شہر کا رہنے والا سجاد سن ہی سکتا تھا۔
''دیکھو بھئی جس کا جو کام ہے وہ اسے کرنا چاہیے اگر وہ ایسا نہ کرے اور اسے سزا دی جائے تو کیا یہ ظلم ہو گا۔ کسان تو کام کرنے کے لیے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ دوچار دن ان میں سے ایسے بھی نکل آتے ہیں جو مکاری کرتے مفت کی کھانا چاہتے ہیں اور جب انہیں اس کی سزا دی جاتی ہے تو لوگ کہتے ہیں ظلم کیا جا رہا ہے۔ ہمارے دادا ابا جب حیات تھے تو ایک بڑا ہیکڑ قسم کا آدمی ملوا گھوسی تھا ایک بار وہ ایک گھوڑا لایا۔ گھوڑا دادا کو پسند آ گیا دادا نے ان کی قیمت دینا چاہی لیکن وہ تیار نہ ہوا اور بدمعاشی دکھانے لگا۔ دوسرے دن رات کو دادا کے آدمی ملوا کر ٹھکانے لگا آئے اور صبح کو لوگوں نے دیکھا گھوڑا ہماری حویلی میں بندھا ہوا تھا کسی کی ہمّت نہیں تھی کچھ کہہ سکتا۔''
''یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہوا۔''
''تو شہر میں رہنے والے کیا جانو زمینداری کیا ہوتی ہے برے وقت میں بھی تو یہی زمیندار مدد کرے ہیں ورنہ سب بھوکوں مر جائیں۔''
سجاد بیچارہ زمینداری کے رموز کو کیا جانے اس نے تو افسانوں میں پڑھا ہے کہ زمیندار کسانوں پر ظلم کرتے ہیں۔
کھیتوں اور باغوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا تانگہ لمحہ بہ لمحہ گاؤں کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ جامن کے اونچے اونچے درخت قلعہ میں جاتے ہوئے راستے پر پہریدار کھڑے ہوں۔ گاؤں کی اکلوتی مسجد کے مینارے ہاتھی کے سیاہ جسم پر ابھرے ہوئے سفید دانتوں کی طرح لگ رہے تھے۔ پھونس اور گوبر کے بنے اپلو کے پٹارے چھوٹے چھوٹے مندروں کی طرح گاؤں کے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ نیم کے اونچے اونچے درختوں نے گاؤں کے اوپر ایک اور سبز آسمان کا سایہ ڈال رکھا تھا۔
گھوڑے کی ٹاپوں سے نکلتی ٹپ ٹپ کی آواز ایک تیرہ چودہ سال پہلے کی کہانی سنا رہی تھی ....
''ڈیوڑھی کے باہر ادھے تیار کھڑے تھے۔ ان میں لگے ہوئے اونچے اونچے بیل اپنے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھروؤں کو بجا بجا کر اپنی آمادگی سفر کا اعلان کر رہے تھے۔ ایک بیل گاڑی میں بستر بند اٹیچی اور کئی کنستر رکھے ہوئے تھے رحیم میاں بے چینی سے ادھر ادھر گھوم کر سب کو ہدایات دے رہے تھے۔

''ارے امام بخش حلوے اور گھی کے کنستر آگے دیکھو کوئی چیز رہ نہ جائے۔ شہر کی ہر چیز میں ملاوٹ ہوتی ہے۔ تندرستی خراب کر دیتی ہے۔ ارے نتھو گھڑے تیار ہو گئے۔ جلدی کرو بھئی ایسا نہ ہو ریل کا وقت نکل جائے۔'' جبکہ ریل کا وقت ہونے میں ابھی کافی دیر تھی۔ تیاریاں مکمل ہو جانے کے بعد شمیم کو اس طرح گاؤں سے رخصت کیا گیا جیسے کوئی شہزادہ کسی مہم کو سر کرنے کے لیے جا رہا ہو یا کوئی بارات جا رہی ہو۔ کافی دیر تک گاؤں کی عورتیں اس مختصر سے قافلے کو جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔

رحیم میاں دو ایک ملازموں کے ساتھ شمیم کو علی گڑھ تک چھوڑنے کے لیے آئے اور پھر اسے چھوڑ کر اس طرح چلے گئے جیسے اب اسی وقت بلائیں گے جب وہ علم کی دولت سے مالا مال ہو جائے گا اور کوئی بڑا افسر بن جائے گا اور ہوا بھی یہی شروع میں ایک دو بار شمیم گاؤں گیا پھر پورے دس سال تک گاؤں نہیں گیا۔ ایم اے کرنے بعد وہیں سے وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن چلا گیا۔

ایک مقام پر پہنچ کر کوچبان نے گھوڑے نما خچر کی راسیں کھینچ کر تانگہ روک دیا اور اتر کر تانگے کے پیچھے بندھے بستر بند کے چاروں طرف بندھی ہوئی رسیوں کو کھولنے لگا ذرا دیر میں اس نے تانگے سے تمام سامان اتار کر ایک طرف کو رکھ دیا۔ یہ جگہ اڈہ کہلاتی تھی۔ تانگے اس سے آگے نہیں جایا کرتے تھے ایک تو آگے سڑک ٹھیک نہیں تھی اور دوسرے سڑک پر کھیلتے ہوئے بچوں کی وجہ سے بڑے سنبھال کر چلانا پڑتا تھا۔ شمیم نے تانگے والے کی طرف دیکھا جواب میں تانگے والے نے کہا ''بس بابو جی تانگے آگے نہیں جاتے ہیں۔'' شمیم سوچنے لگا یہ سب کیا ہو رہا ہے میرے دوست کے سامنے میری توہین کیوں کی جا رہی ہے۔ شمیم سب کی صورتوں کو ذہن میں نقش کر کے منصوبے بنا رہا تھا کہ گھر پہنچتے ہی ان سب کی کھال کھنچوانی ہے۔ سجاد نے شمیم کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

''ارے یار کتنی دور ہے ہم ہی لیے چلتے ہیں۔'' اس نے اٹیچی ہاتھ میں اٹھائی۔

''ارے رکھو! یہی سب سالے اپنے سروں پرکھ کر پہنچائیں گے۔'' شمیم نے اٹیچی زمین پر رکھوا دی اور تانگے والے سے کہا۔

''یہ سامان ہمارے یہاں تک پہنچاؤ۔''

''صاحب ہم یہ کام نہیں کرتے ہمارے پیسے دے دو ہمیں گھوڑے کے لیے گھاس لینی ہے۔'' تانگے والے کو شمیم کی یہ بات نہ صرف عجیب سی لگی بلکہ ناگوار بھی گذری۔ شمیم کو لگا جیسے کسی نے اس کی ننگی پیٹھ پر کوڑا مارا ہو اس نے سوچا کہ شاید یہ مجھے پہچان نہیں رہا ہے کہ میں کون ہوں۔

''گھاس واس بعد کو خریدنا پہلے یہ سامان پہنچاؤ'' شمیم کا لہجہ کچھ سخت تھا۔

''پیسے تو دیؤ صاحب آپ کو کس کے گھر جانا ہے۔'' شمیم کا شک صحیح نکلا کہ یہ مجھے پہچانتا نہیں۔ اس نے کچھ اس انداز سے اپنے ابا کا نام لیا جسے تانگے والا یہ نام سن کر ڈر جائے گا۔

''رحیم خاں کی حویلی پر''

''ارے ان چکی والے ملا جی کے یہاں'' تانگے والے نے برجستہ جواب دیا لیکن شمیم آتش فشاں کی طرح ابل پڑا اور اس کا داہنا ہاتھ تانگے والے کے منہ پر جا پڑا ''بد تمیز ہم جتنی شے دے رہے ہیں تو اتنا ہی بد کلام ہوتا جا رہا ہے۔''

تانگے والا غریب تھا تو کیا ہوا عزت تو اس کے پاس بھی تھی شمیم کے اس چانک حملے کو ضبط نہ کر سکا۔

''صاحب رئیس زادے ہو گے اپنے گھر کے ....کسی کی دَبی میں نہیں رہتے کام کرتے ہیں تو پیسے مانگتے ہیں۔''

شمیم کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ زندگی میں یہ پہلا حادثہ تھا جب ایک تانگے والے نے اس کی عزت پر ضرب کاری لگا ئی تھی۔ ذرا دیر میں ''کیا بات ہے'' ''کیا بات ہے'' کرتے ہوئے آدمی اس جگہ اکٹھے ہو گئے تانگے والے نے اپنی مظلومیت کی دہائی دی۔

''ان کو اسٹیشن سے لایا ہوں گھنٹہ بھر ہو گیا پیسے نہیں دے رہے اوپر سے کہتے ہیں کہ یہ سامان ہمارے گھر پہنچا دو جیسے ان کے باپ نے ہمیں نوکر رکھا ہے۔''

اب شمیم کو اس بھیڑ میں اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا وہ سب کی نظروں میں جھانک کر یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کیا یہ مجھے پہچان رہے ہیں کہ یہ ابراہیم خان کا پوتا ہے جن کے ایک اشارے پر گاؤں کے لوگ دریا کا بہاؤ بدلنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ لیکن اس بھیڑ میں سب کے چہروں پر نئی آنکھیں لگی ہوئی تھیں اور شمیم پُرانی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور پرانی آنکھوں کی تلاش میں تھا جو اسے دیکھ کر سلام کیے لیے جھک جائیں سامان کے پاس کھڑا سجاد خود کو کسی نئی مخلوق کے درمیان محسوس کر رہا تھا۔ اس ماحول میں اسے گھٹن ہو رہی تھی اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس نے پرس نکال کر کچھ پیسے تانگے والے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

''لو بھئی کتنے پیسے ہوئے تمہارے، سب رکھو۔'' اتنا کہہ کر وہ سامان اٹھانے لگا شمیم اپنی شکست سے اپنے وجود کو بکھرتا محسوس کر رہا تھا۔ اُسی وقت ایک جوان آدمی آگے آیا اور شمیم کو دیکھنے لگا دوسرے ہی لمحے کچھ کہے بغیر سامان کی

طرف بڑھا اور سجاد کے ہا تھ سے سامان لے لیا۔ ''لائیے ہم لے چلیں۔'' سجاد اسے روکتا رہ گیا لیکن اس نے سجاد کے احتجاج کو تسلیم نہ کیا اور سامان کو اٹھا کر اس طرح آگے بڑھ گیا جیسے کوئی تھیلا لٹکا کر بازار کو جاتا ہے۔ شمیم اس آدمی کو بس ایک جھلک ہی دیکھ سکا اس کی نظریں صرف اُس کے میلے کپڑوں پر پڑیں۔ وہ آدمی تیز تیز قدم رکھتا ہوا آگے جا رہا تھا۔
سجاد نے شمیم کو اشارہ کیا اور وہ دونوں ایک احساس ندامت لیے ہوئے اس آدمی کے پیچھے پیچھے چلنے لگے جس نے سامان لے جا کر ان کے احساس ندامت میں کچھ کمی کر دی تھی۔ بھیڑ میں کوئی پوچھ رہا تھا۔
''کون لوگ ہیں جی؟''
کوئی دوسرا جواب دے رہا تھا۔
''لگتا ہے رحیم میاں کا چھوٹا للا ہے بہت دنا میں بدیس سے آیا ہے بے چارہ اب بھی.....''
باقی الفاظ پیچھے رہ گئے اور وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔ شمیم نگاہیں جھکائے ہوئے سجاد کے ساتھ چل رہا تھا اس نے سامان لے جانے والے آدمی کو دیکھا بھی نہیں۔ سجاد کے بولنے پر بھی اس نے بات نہیں کی۔ سجاد کی نگاہیں چاروں طرف گھوم رہی تھیں اچانک وہ آدمی مع سامان کے ایک گھر میں داخل ہو گیا دروازے کے آگے تھوڑا سائبان پڑا تھا ایک طرف چھپّر میں دو کمزور سے بیل جگالی کر رہے تھے۔ دوسری جانب آٹا پیسنے کی چکّی چل رہی تھی جس دوکان میں چکی لگی ہوئی تھی اس کے آگے چھوٹا سا برآمدہ تھا جس میں اناج تولنے کا کانٹا لگا ہوا تھا۔ کانٹے کے قریب گلّے پر بیٹھے ہوئے ایک بزرگ اناج تول رہے تھے۔ ان کے کپڑوں پر آٹے کی تہیں جمی ہوئی تھیں سفید داڑھی کو گیہوں کے آٹے نے اور بھی سفید کر دیا تھا۔ وہ دونوں پلڑوں کو برابر کر رہے تھے۔ سجاد سوچنے لگا کہ کیا یہی شمیم کا گھر ہے۔ شمیم تو کہتا تھا کہ اس کی بہت بڑی حویلی ہے لیکن یہاں تو کچھ بھی نہیں۔ سجاد نے شمیم کو نیند سے جگایا۔
''ارے شمیم کیا گھر آ گیا وہ صاحب تو مع سامان کے اندر چلے گئے۔''
یہ نیم کا درخت اور کنواں تو وہی ہیں اس کی نگاہیں چکّی تک پہنچی یہاں تو مردانہ تھا لیکن اس میں چکّی کب سے لگ گئی اچھے خاصے کمرے کا ستیا ناس کر دیا اچانک اس کی نگاہیں گلے پر بیٹھے ہوئے رحیم میاں پر پڑیں اُسے تانگے والے کے الفاظ یاد آئے۔ ارے ان چکی والے ملّا جی کے یہاں'' وہ دیکھتا رہ گیا اس کے منہ سے ایک حرف بھی نہ نکلا اسے لگا جیسے ان کی قوت گویائی کسی نے چھین لی ہو اور جب رحیم میاں کی نگاہیں اس پر پڑیں تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوئے، برابر ہوتے ہوئے پلڑے اُوپر نیچے لگے برسوں کی دبی ہوئی پدری محبت و شفقت اُبل پڑی۔
''شمو بیٹے تم آ گئے .... ارے تم نے اطلاع کیوں نہیں دے دی میں کسی کو اسٹیشن بھیج دیتا۔ کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔ ارے آؤ تم لوگ کھڑے کیوں ہو۔'' سجاد شمیم کے والد کو پہچان گیا اس نے بڑھ کر سلام کر کے مصافحہ کیا لیکن شمیم بالکل خاموش کھڑا تھا۔ رحیم میاں بہت خوش نظر آ رہے تھے انہیں لگ رہا تھا ان کے پچھلے دن پھر لوٹ آئے۔ شمیم ہی کے لیے تو انہوں نے بے دریغ روپیہ خرچ کیا تھا اس امید پر کہ شمیم ایک بڑا آدمی بنے گا۔ رحیم میاں نے جلدی سے چکی والے برآمدے کے سامنے نیم کے درخت کے نیچے ایک چار پائی ڈالتے ہوئے کہا۔
''آؤ بیٹے آؤ یہاں سائے میں بیٹھو تھک گئے ہو گے۔ تم لوگوں کا سامان کہاں ہے۔''
سجاد بڑھ کر چار پائی پر بیٹھ گیا۔ رحیم میاں شمیم کو اپنے ساتھ لے کر گھر کے دروازے کی طرف بڑھے اور دروازے سے ہی پکارے۔
''ارے شمو کی ماں! دیکھو تو سہی کون آیا ہے۔ تمہارا بیٹا آ گیا۔ ارے دیکھو کیسا بابو بن گیا ہے۔ ارے سلیم کہاں ہے دیکھ تیرا جوڑا ہو گیا۔ کوئی بچہ ذرا نعیمہ کے یہاں کہلوا دو تیرا بھیا آ گیا ہے۔''
رحیم میاں خوشی سے پاگل ہوئے جا رہے تھے دروازے میں داخل ہوتے ہی بوڑھی ماں نے شمیم کو چھاتی سے لگا لیا کب سے اپنے جگر کے ٹکڑے کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھی۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار خوشی کے آنسو بہنے لگے۔
ایک کمرے سے دھلے ہوئے کپڑے پہن کر سلیم نکلا۔ شمیم نے سلیم کی طرف دیکھ کر سلام کرنے کے لیے سر کو جنبش دی لیکن شمیم کو ایک اور دھچکا لگا یہ وہی آدمی ہے جو سامان اٹھا کر لایا تھا۔ یہ بھیا تھے میں نے پہچانا بھی نہیں سلیم برادرانہ جوش میں چھوٹے بھائی سے بغل گیر ہو گیا۔ آج اسے لگ رہا تھا جیسے اس کی طاقت اور عزت بڑھ گئی ہے۔ بھائی بھائی کا داہنا بازو ہوتا ہے۔ لیکن شمیم کے اندر کوئی جوش نہ تھا وہ تو اس درخت کی طرح بے جان سا کھڑا تھا جو آندھی میں گر گیا ہو اور جڑ سے صرف ذرا سا حصّہ جڑا ہوا ہو۔ وہ نئے گھر کو اجنبی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا گھر ٹوٹ کر نیا ضرور بن گیا تھا لیکن اس میں کہیں وہ پرانی عظمت اور جلال دکھائی نہیں دے رہا تھا جس کے آگے گاؤں والوں کی نگاہیں جھکنے کے لیے مجبور تھیں۔ ترازو کے پلڑوں کو برابر کرتے رحیم میاں نے اپنے آپ کو بھی سب کے برابر کر لیا تھا۔
شمیم کیا کیا سوچ رہا تھا لیکن یہاں آ کر تو اس کے تمام ارادے بارش کے پانی میں سڑک پر پڑے ہوئے تنکوں کی طرح بہہ گئے اس نے سجاد کے سامنے اپنی زمین داری کا کیسا نقشہ کھینچا تھا اسے کیا معلوم تھا بساط الٹ چکی ہے۔ نقشہ بدل چکا ہے۔

سجاد بھی کیا سوچ رہا ہو گا کہ یہی ان کا مہمان خانہ ہے کہ نیم کے نیچے ایک چارپائی ڈال کر مہان کو بٹھا دیا جائے کہاں ہے وہ ڈیوڑھی جس میں گھوڑے بندھتے تھے کہاں ہیں وہ خدمت گار جو ایک اشارے پر بھاگتے نظر آتے تھے۔ شمیم تو بڑی ڈینگیں مارتا تھا اور جب وہ بھیا کو دیکھے گا تو کیا سمجھے گا ارے یہی تو ہمارا سامان لے کر آئے تھے یہ تمہارے بھیا ہیں تم نے پہچانا بھی نہیں۔ شمیم کی دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اپنے شاندار ماضی کی یادوں کو لیے حال سے بے نیاز ہو کر اس میں سما جائے یا اپنے سر کو دیواروں سے ٹکرائے۔

رحیم میاں چکی کا کام کسی اور آدمی کے سپرد کر کے پھر گھر میں آ گئے اور آتے ہی بولے۔

''ارے اسے ابھی بٹھایا بھی نہیں، تھک گئے ہوں گے بیچارے۔ اتنی دور سے آ رہے ہیں باہر شمو کے دوست بیٹھے ہیں انہیں شمو کے کمرے میں بٹھا دو۔''

رحیم میاں نے دوبارہ گھر بنواتے وقت اس بات کا خیال رکھا تھا کہ شمو بڑا آدمی بن کر آئے گا اس کے لیے ایک الگ بڑا سا کمرہ ہونا چاہیے اسی لیے انہوں نے ایک کمرہ جس کا ایک دروازہ باہر کی طرف اور دوسرا گھر میں کھلتا تھا۔ صرف شمیم ہی کے واسطے بنوایا تھا۔ سلیم نے جلدی سے جا کر کمرے میں پڑی ہوئی پرانی کرسیوں کی گرد صاف کی۔ کمرہ اچھا خاصا صاف ستھرا بنا ہوا تھا دیواروں پر نہ صرف پلاسٹر ہو رہا تھا بلکہ سفید قلعی سے پتائی بھی کی گئی تھی۔ اینٹوں کا فرش تھا جبکہ باقی گھر کا فرش پیلی پیلی مٹی سے لپا ہوا تھا۔ دیوار سے ملا ہوا آتش دان کے نیچے ایک بڑا تخت بچھا ہوا تھا جس کی لکڑی ابھی پوری طرح گھُنی نہیں تھی تخت کے اوپر ایک بوسیدہ قالین بچھ رہا تھا جو اپنی قدامت کو خود ہی ظاہر کر رہا تھا جگہ جگہ سے اس کے اوپر کارواں اڑ گیا تھا تخت پر ایک گاؤ تکیہ بھی تھا جس کے غلاف کا پیوند لگا ہوا حصہ پیچھے کی طرف کر دیا گیا تھا۔ تخت کے داہنی جانب ایک بڑا سا حقہ رکھا ہوا تھا آتش دان پر رکھا ہوا ہرن کا سر اور دیوار پر ٹنگی ہوئی کھال اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ اس گھر کے لوگ کبھی شکار بھی کھیلا کرتے تھے الماری میں چند برتن رکھے ہوئے تھے جن کے بکنے کی ابھی نوبت نہیں آئی تھی۔ شمیم اس کمرے میں پہنچا تو اسے لگا جیسے ابا نے اس کے آنسو پونچھے ہیں اور اپنے کھوئے ہوئے وقار کو اس کمرے میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے جیسے ان کے ماضی کی عزت اور عظمت صرف اسی ایک کمرے تک محدود ہے۔ سلیم نے باہر بیٹھے ہوئے سجاد کو کمرے میں بلایا۔ رحیم میاں کو یہ بات پریشان کیے جا رہی تھی کہ شمو خاموش کیوں ہے اسی لیے جب سے وہ آیا تھا کئی بار اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھ چکے تھے۔ سلیم نے گھر آ کر کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔

رات کے کھانے کے لیے رحیم میاں نے اچھے کھانے تیار کرائے تھے۔ کھانے سے نکلتی ہوئی خوشبوئیں ان کی یادوں کی جمی ہوئی تہیں کھول رہی تھیں۔ کتنے ہی حالات خراب رہے چاہے کچھ بیچنا ہی کیوں نہ پڑا ہو۔ رحیم میاں نے اپنے وضع داری کو کبھی ٹھیس نہ پہنچنے دی۔ جب بھی ان کے گھر کوئی مہمان آتا اس کے لیے اسی طرح دستر خوان چنا جاتا جیسے اچھے دنوں میں تواضع کی جاتی تھی۔ اب بھی رحیم میاں جب کبھی دوسرے گاؤں جاتے تو بکس میں رکھی ہوئی اپنی اکلوتی شیروانی اور ناگرہ نکال کر پہنتے اور چھڑی ہاتھ میں لے کر اسی شان سے باہر نکلتے جو کبھی ان کے قدموں کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ لیکن اب اندر کچھ بھی نہیں تھا صرف اپنی وضع دار کو ٹوٹی ہوئی بیساکھیوں کے سہارے چلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

کھانے کے وقت تک شمو کی بعض کیفیات سے رحیم میاں نے محسوس کر لیا تھا کہ شمو خاموش کیوں ہے اسی لیے جب رات کو کھانے وغیرہ سے فارغ ہو گئے تو رحیم میاں نے شمو کو اپنے پاس بلایا اور قریب بٹھا کر وہ باتیں بتانے لگے جن کو آج تک اس سے پوشیدہ رکھا گیا تھا۔

''بیٹے میں محسوس کر رہا ہوں کہ جب سے تم آئے ہو کچھ پریشان ہو میں نے تمہیں بولتے ہوئے نہیں دیکھا میں جانتا ہوں اس کا سبب کیا ہے۔ آج تک میں نے تمہیں کوئی بات نہیں لکھی لیکن بہتر ہے کہ آج تم بھی گھر کے حالات سے واقف ہو جاؤ۔ جس وقت تم یہاں سے گئے تھے تمہارے یہاں بہت کچھ تھا تمہارا باپ گاؤں کا سب سے بڑا رئیس تھا کچھ ہی برس بعد تمہارے تینوں چچا علاحدہ ہو گئے انہیں نے اس زمین کے حصے بانٹ لیے جس پر ایک گھر کاہل چلا کرتا تھا اور اس حویلی میں دیواریں کھڑی کر لیں جس میں ایک چولہا جلا کرتا تھا۔ تمہارے دادا کی ہر چیز چار حصّوں میں بٹ گئی اس بٹوارے کے ساتھ ہی ہماری وہ ساکھ بھی ختم ہو گئی جو گاؤں پر چھائی ہوئی تھی۔ زمین اب بہت کم رہ گئی تھی اور یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اپنی پرانی شان باقی رکھنے کے لیے نعیمہ کی شادی پر میں نے دس بیگھے زمین بیچی تھی۔ تم پڑھائی کے لیے جا چکے تھے تمہیں میں نے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ زمینداری ختم ہو گئی تم نے جب بھی لکھا یا نہ لکھا میں روپے بھیجتا رہا اور اس کے لیے مجھے تمہاری ماں کا زیور بھی بیچنا پڑا۔ میں نے گھر بلانے کے لیے تم سے بھی اس لیے اصرار نہیں کیا کہ یہاں آ کر تمہیں جب حالات معلوم ہو گے تو صدمہ ہو گا اور جب زمین کی پیداوار میں گذارا دکھائی دیا تومیں نے تھوڑی سی زمین اور نکال کر چکی لگوائی۔ گھر عجیب بے ڈھنگا سا ہو گیا تھا اس لیے دوبارہ بنوایا۔ ان سب کاموں کے ساتھ ساتھ میری ایک امید چل رہی تھی جس نے ہر مقام پر مجھے قوت بخشی اور وہ امید تھی تمہارا روشن مستقبل۔ تم پڑھ لکھ کر کچھ بن جاؤ

گے اور حالات پھر ٹھک ہو جائیں گے۔ اور پھر اچانک تم وہاں سے مزید تعلیم کے لیے لندن چلے گئے۔‘‘
شمیم خاموشی سے سر جھکائے یہ سب باتیں سن رہا تھا غالباً باہر والے کمرے میں بیٹھے ہوئے سجاد نے بھی یہ سب باتیں سن لی تھیں۔ رحیم میاں خاموش ہو گئے۔ دوستوں کی محفل میں چہکنے والے شمیم پر گاؤں میں آ کر ایک عجیب سی سنجیدگی طاری ہو گئی تھی۔ اس کی طالب علمی اور لا ابالی پن کا دور ختم ہو چکا تھا۔ اب وہ مستقبل کے فریموں میں لگی ہوئی تصویروں کو بدل رہا تھا کہاں سے سجاد کے ساتھ اس کا پہاڑی علاقے پر جانے کا پروگرام تھا لیکن وہ اس پروگرام کو بدل کر کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔
دو ایک روز ٹھہرنے کے بعد سجاد نے شمیم سے واپس جانے کے لیے کہا تو وہ اسے روک بھی نہیں سکا بلکہ جب رحیم میاں کو معلوم ہوا تو انہوں نے سجاد سے رکنے کے لیے کہا۔
’’بیٹے دو ایک دن اور ٹھہر کر چلے جانا۔ یہاں تمہارا دل بھی تو نہیں لگتا ہو گا، نہ تمہاری کوئی خاطر ہی ہو سکی۔‘‘
’’نہیں چچا جان آپ کیسی بات کرتے ہیں آپ لوگوں کی محبت اور خاطر تومیں کبھی نہیں بھول سکتا ابھی مجھے کچھ ضروری کام ہے پھر کبھی وقت ملا تو ضرور آؤں گا۔‘‘
سجاد کے ساتھ ہی شمیم بھی واپس جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ رحیم میاں نے سبب معلوم کیا اور جواب پا کر خاموش ہو گئے لیکن اس کی ماں کو معلوم ہوا تو وہ تڑپ گئیں۔
’’نہیں شموا بھی نہیں جائے گا کتنے برسوں کے بعد آیا ہے اور اتنی جلدی چلا جائے گا۔‘‘
’’امّاں میں جلدی لوٹ آؤں گا ابھی مجھے کئی جگہ نوکری کے لیے کوشش کرنی ہے۔‘‘
سجاد نے بھی شمیم کی آواز سن لی تھی۔ ماں نے رحیم میاں کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش تھے شمیم کی ماں کے حلق میں یہ الفاظ پھنس کر رہ گئے کہ
’’شموّ زمینداروں کے بیٹے نوکری نہیں کیا کرتے بلکہ نوکر رکھا کرتے ہیں‘‘ لیکن اِس کے بجائے ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔
’’ہاں بیٹے جاؤ خدا تمہیں کامیاب کرے۔‘‘
اور شمیم اپنا سامان خود اپنے ہاتھ میں اٹھا کر باہر آ گیا۔

***

ماخذ:

http://www.ibnekanwal.com
https://www.rekhta.org/ebooks/band-raste-ibne-kanwal-ebooks?lang=ur

تدوین اور ای بک کی تشکیل: اعجاز عبید